

اسلام: مستقبل کی بازیافت



اسلام مستقبل کی بازیافت

راشد شاز

ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی - ۲۵

سال اشاعت ۲۰۰۵ء

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : اسلام: مستقبل کی بازیافت
مصنف : راشد شاز
اشاعت : ۲۰۰۵ء
قیمت : ۲۰ روپے
مطبع : گلورس آفسیٹ، نئی دہلی-۲

ISBN: 81-87856-19-X

ناشر

ملی پہلی کیشنرز

ملی ٹائمز بلڈنگ ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

Tel: +91-11- 26926246, 55735981

Fax: +91-11-26325499

Email: militime@del3.vsnl.net.in

www.peaceindia.com



found.





آج اکیسویں صدی میں امت مسلمہ نویں، دسویں صدی کی فقہی دنیا میں جینے پر مجبور ہے۔ مذہبی زندگی کی قیادت ان افراد کے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے جو اپنی اپنی قبروں میں صدیوں سے آرام فرما رہے ہیں اور جنہیں یقیناً اکیسویں صدی کے حالات سے ناواقفیت کے لئے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ صدیاں گزر گئیں امت زندہ چلتی پھرتی قیادت اور زندہ ذہن و فکر سے محروم ہے۔ یہ ہے وہ صورتِ حال جس کی شکایت خدا کی کتاب اپنے حاملین سے کر رہی ہے ﴿يَا رِبِّ انْ قَوْمِى اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا﴾

(الفرقان: ۳۰)۔

فہرست

- ◆ پیش لفظ..... ۹
- ◆ ایک نئی ابتداء کا اہتمام..... ۱۳
- ◆ سلسلہ غور و فکر کی موت..... ۱۹
- ◆ مستقبل اسلامی کی تلاش..... ۲۷
- ◆ کیا ایک نئی پیہرا نہ بصیرت ممکن ہے؟..... ۳۵
- ◆ امت مسلمہ کی تشکیل نو..... ۴۵
- ◆ اس شرک سے نجات کا بھی کوئی راستہ ہے؟..... ۶۱
- ◆ مسلم فکر میں انقلاب کی ضرورت..... ۶۷
- ◆ آخر کب آئے گی خدا کی مدد؟..... ۷۳
- ◆ پیہرا نہ لب و لہجہ کا غیاب..... ۸۵
- ◆ عورت کی امامت..... ۹۵
- ◆ کہاں گئی وہ چپٹی ناک والی عورت..... ۱۰۳
- ◆ مسئلہ فلسطین: حق کے دو بول..... ۱۰۷
- ◆ ایک نئی دینیات کی ضرورت..... ۱۱۳
- ◆ اسلام میں اصلاحی تحریک کی معنویت..... ۱۲۳
- ◆ اسلام کو نئے شارحین کی ضرورت..... ۱۳۳
- ◆ مابعد جمہوریت اور اسلام..... ۱۳۹
- ◆ تقلید فکر و نظر کی دعوت..... ۱۴۹
- ◆ بین الاقوامی کاؤنسل برائے اسلام..... ۱۵۵



وحی کے سلسلے میں ہمارا تجربہ ایک ایسی روشنی کا ہے جس نے کوئی چودہ صدیوں پہلے اہل ایمان کے ایک گروہ کو غیر معمولی تقلیب فکر و نظر سے دوچار کر دیا تھا، فکر و نظر کا یہ انقلاب ہمارے لئے ماضی کی ایک مقدس داستان ہے، ہم فی نفسہ اس تجربے سے نا آشنا ہیں۔ گویا قرآن کی حیثیت اور اس کا عملی رول ہمارے درمیان روشنی کی ایک داستانِ سابقہ کی ہے، روشنی کی نہیں۔ اور یہ وہ صورت حال ہے جس نے صدیوں سے پوری امت کو روشنی سے ظلمت کی طرف ایک سفر معکوس میں مبتلا کر رکھا ہے۔

پیش لفظ

یہ کتاب ان سلسلہ ہائے مضامین کی ایک کڑی ہے جو گیارہ ستمبر کے بعد مختلف اوقات میں املا کرائے گئے ہیں۔ زندہ قومیں اپنے خلاقی رویے اور نصرت الہی کے سہارے سنگین بحران کو بھی حیرت انگیز امکانات میں بدل سکتی ہیں۔

اب تک مسلم اہل فکر عظمتِ رفتہ کی بازیابی کا محض نعرہ بلند کرتے رہے ہیں۔ گزرے وقتوں کو اس طرح یاد کرنا کہ قومیں اس نیم رومانی ماحول کی اسیر ہو جائیں، یہ رویہ نہ صرف یہ کہ انہیں حال سے فرار پر مجبور کرتا ہے بلکہ ان کے دل و دماغ میں مستقبل کے سلسلے میں موہوم اندیشوں کو بھی جنم دیتا ہے۔ ماضی اگر حال کے جائزے پر آمادہ نہ کرے اور اس سے مستقبل کو بہتر بنانے کا حوصلہ نہ ملے تو قومیں ماضی کی اسیر ہو جاتی ہیں اور ایسی قوموں کو معاصر دنیا میں اپنے لئے کوئی مفید رول دکھائی نہیں دیتا۔ بد قسمتی سے ہم مسلمان ماضی کا اسی نیم رومانی انداز سے تذکرہ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

”مستقبل کی بازیافت“ میں ان عوامل کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے جن کے ذریعے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تبعین ایک بار پھر دنیا کی سیادت پر فائز ہو سکتے ہیں۔ وہ بات جس کی طرف ہم دعوت دے رہے ہیں کوئی نیا نسخہ نہیں بلکہ کتاب و سنت کی طرف واپسی کی وہی دعوت ہے جو گزشتہ صدیوں میں بھی مسلم اہل فکر کی طرف سے دی جاتی رہی ہے البتہ اب تک کتاب و سنت کی طرف واپسی کی تحریکیں اگر اپنے مقاصد میں ناکام رہیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ خود اس صدائے انقلاب کے بلند کرنے والوں پر واپسی کے اسرار و عواقب واضح نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تمام حضرات کتاب کی طرف واپسی کے نام پر اپنے اپنے

فقہی خیموں کے استحکام کی دعوت دیتے رہے۔ انسانوں کی تشریح و تعبیر سے ماوراء، متقدمین کی زمانی اور مکانی فہم و بصیرت سے پرے، وحی ربانی سے راست اکتساب ہمارے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ معاصر تاریخ میں ایسے مفکرین کی کمی نہیں جو زندگی بھر قرآن مجید کے علمی مطالعہ میں مشغول رہے بلکہ جاتے جاتے انہوں نے ضخیم مجلدات پر مشتمل تفسیروں کا انبار بھی چھوڑا لیکن اس کے باوجود وہ آخری لمحہ تک حنفی یا شافعی بنے رہے۔ بھلا جب چالیس پچاس سال کا قرآنی مطالعہ بھی ہمیں قرآن مجید سے راست اکتساب پر آمادہ نہ کر سکے اور ہم خود کو اس بات پر مجبور پائیں کہ اپنی عملی زندگی میں فقہائے متقدمین کی فہم و بصیرت کی تقلید کریں اور ان سے سراسر موخلاف کو نفیض ایمان جانیں تو پھر نصف صدی کے قرآنی مطالعہ کو محض علمی تقن و طبع کے علاوہ اور کیا کہا جاسکے گا۔ اس بات پر ایمان کے باوجود کہ قرآن مجید خدا کی آخری کتاب ہے اور دین کی تکمیل عہد رسالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہو گئی، آخر کیا وجہ ہے کہ بعد کی صدیوں میں آنے والے علماء و مفکرین کو ہم نے اساطین دین قرار دے رکھا ہے اور ہم میں سے بعض تو یہاں تک سمجھ بیٹھے ہیں کہ ائمہ اربعہ کا ظہور من جانب اللہ تھا جن کے فہم دین سے اختلاف ہمارے ایمان کے لئے سم قاتل ہوگا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اپنی تمام تر جلالت علمی اور ورع و تقویٰ کے باوجود اسلام کے یہ مایہ ناز سپوت ہماری ہی طرح انسان تھے جن سے فکری التباسات کا صدور عین ممکن تھا۔ اگر ہم واقعی کتاب و سنت کی طرف واپسی میں سنجیدہ ہیں تو ہمیں صدیوں پر مشتمل ان تعبیری اور تفسیری ادب کو عبور کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا جہی یہ ممکن ہے کہ وحی کی تجلیوں سے ہماری راہیں اسی طرح منور ہو جائیں جس طرح عہد رسول میں ہوئی تھیں۔

ایک ایسی امت جو نبی آخرؑ اور آپؐ کے تبعین کی قیادت میں محض پچاس ساٹھ سال کے مختصر عرصے میں چہار سمت کچھ اس طرح چھائی جاتی تھی، جس پر آج بھی مورخین انگشت بدنداں ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ وہ صدیوں سے زوال پذیر ہے۔ ہمارے مصلحین اتحاد امت کی کوششوں میں بری طرح ناکام ہیں۔ ہمارے لئے یہ تو ممکن ہے کہ ہم جابر سے جابر دشمنوں کو شکست دے سکیں لیکن جب ایک متبادل نظام کے قیام کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ہماری تلواریں آپس میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ ہم میں سے ہر گروہ اپنے فرقے کا اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے مزید چشم پوشی کرنا میرے نزدیک جرم عظیم ہے، کتمان حق ہے۔ لازم ہے کہ اس فکری انتشار کا فی الفور علاج کیا جائے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم تفرقہ کی اصل بنیادوں پر تیشہ چلانے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

یہ مضامین چونکہ مختلف اوقات میں املا کرائے گئے ہیں اس لئے ان میں بعض خیالات کی تکرار شاید کہیں کہیں گراں معلوم ہو۔ یا ممکن ہے اس تکرار سے ان باتوں کو ذہن نشین کرانے میں مدد ملے جو اس کتاب کا ہدف ہیں۔ ان تحریروں کو علمی حوالوں سے بوجھل نہیں کیا گیا ہے تاکہ عام قاری کی دلچسپی برقرار رہے۔ ہو سکتا ہے بعض بیانات مزید دلائل اور دستاویزی ثبوت چاہتے ہوں، میں نے ایسے تمام دلائل اپنی دراز میں محفوظ کر رکھے ہیں تاکہ مستقبل میں سوال قائم کرنے والوں کی تشریفی کی جاسکے اور اس لئے بھی کہ اس خیال کی مزید تشریح و تعبیر میری پیش آمدہ تحریروں میں مل سکے۔

خدا کرے اس مختصر کتاب کی اشاعت سے ان عناصر کی دریافت میں مدد ملے جو قرن اول کے مسلمانوں کو اقوامِ عالم کی سیادت پر فائز کرنے کا سبب بنے تھے۔ آمین!

راشد شاہ

۱۱ ستمبر ۲۰۰۵ء

نئی دہلی۔ ۲۵



دین کی طرف ہماری واپسی بڑی حد تک فقہی رسوم کی بازیافت سے عبارت رہی۔ وحی ربانی پر انسانی تعبیرات نے التباسات کی جو دیز دھند طاری کر رکھی تھی اس کے اسرار و عواقب کا صحیح اندازہ لگانے میں ہم سے سخت غلطی ہوتی رہی۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے ہم اس بات کے سزاوار ہیں کہ دنیائے انسانیت کو راہ یاب کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں لیکن ایسا تب ہی ممکن ہے جب خود ہمارا فکری اور عملی وجود راست وحی ربانی سے غذا حاصل کرتا ہو۔

ایک نئی ابتداء کا اہتمام

فی زمانہ امت مسلمہ ایک بڑے بحران سے دوچار ہے۔ باشعور اور فکر مند مسلمان خود اپنے آپ سے سوالی ہے آیا وہ اس نئی صورت حال کے پیش نظر اپنے فکر و نظر کی دنیا کو از سر نو ترتیب دے، اپنے روایتی طریقہ کار کا سخت محاسبہ کرے یا پھر اپنے آپ کو تاریخ کے رحم و کرم پر یونہی چھوڑ دے۔ تاریخ کے آگے خود سپردگی فی نفسہ کوئی سوچا سمجھا لائحہ عمل نہیں ہو سکتا۔ رہی یہ بات کہ صورت حال کے ازالے کے لیے کیا کیا جائے تو اس بارے میں مسلم ذہنوں میں بالعموم ایک محیط اور پُراسرار سنالے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ گویا ہم ایک ایسی وادی میں آٹکے ہوں جہاں آگے چلنے کی کوئی روایت نہ ہو۔ قدموں کی چاپ سے ہمارے کان نا آشنا ہوں۔

جو لوگ ہماری تاریخ سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے جب ہمارا ملّی کارواں خطرات کے گرداب میں پھنس گیا ہو، اس سے پہلے بھی کم از کم چار ایسے مواقع آئے ہیں جب من حیث القوم ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کا چراغ گل ہوتا ہوا محسوس ہوا ہے۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کی شہادت، خلافت عباسی کا زوال، سقوطِ غرناطہ اور انہدامِ خلافتِ عثمانیہ ہماری تاریخ کے وہ بحرانی لمحات ہیں جن سے پہلے بھی ہم ٹکٹنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنی تاریخ کے اس پانچویں بحران میں، جس سے آج ہم دوچار ہیں، ہمارے دل و دماغ پر کسی جائے پناہ کے نہ ملنے کا احساس ماضی کے مقابلے میں کہیں گہرا ہے۔ سکڑتی دنیا میں جہاں مواصلاتی سیارچوں کی آنکھیں شب و روز ہمارے تعاقب میں ہیں، جہاں امریکی استعمار نے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مختلف اڈوں کے ذریعے اپنے مخالفین کی ہر آواز کو دبانے کا عزم کر رکھا ہے، کم از کم نفسیاتی طور پر تو یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ صدر بئش کے الفاظ

میں ان کے مخالفین کے لیے ”اس سرزمین پر اب کہیں کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہ گئی ہے“۔ عراق پر امریکی استعمار کے راست قبضے، افغانستان کا عملی طور پر امریکی نوآبادی میں تبدیل ہو جانا، لیبیا اور ایران کی نیوکلیائی مسئلے پر خود سپردگی، پاکستان اور دوسری مسلم ریاستوں کی شب و روز تذلیل و تضحیک، اس منظر نامے میں ہمارے علما اور دانشوروں کے محض احتجاجی بیانات، مذمت کی قراردادیں یا برسرِ پیکار مسلح جوانوں کا ایک ہارتی ہوئی جنگ کو مزید اسی روایتی انداز سے جاری رکھنا اس بات پر دال ہے کہ ہم بحران کے ان سخت لمحات میں بھی کسی واضح رہنمائی اور سوچے سمجھے منصوبے سے یکسر خالی ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب، امن پسند دانشور ہوں یا مسلح جنگجو، قدامت پرست علماء ہوں یا روشن خیال دانشور، واقعہ یہ ہے کہ ہم اس شعور سے خالی ہیں کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟

حقیقت گو کہ انتہائی تلخ ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ آج امت مسلمہ اپنے فکری زوال اور عملی انتشار کی وجہ سے خیر امت کے منصبِ جلیل سے معزول ہو چکی ہے۔ آج جو لوگ دنیا کی عملی قیادت کر رہے ہیں یا جو یہاں سیاہ و سفید کے فیصلے کا اختیار رکھتے ہیں بد قسمتی سے وہ ہم نہیں۔ ہماری موجودہ بد حالی اور فکری زوال اپنے پیچھے صدیوں کی تاریخ رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قتلِ عثمان سے وحی کا جو اجتماعی ماحول متزلزل ہوا اس نے آنے والے دنوں میں ہمارے لیے فکری پراگندگی کا مسلسل مواد مہیا کیا ہے۔ تب سے اب تک ہم مسلمان ماخذِ وحی سے مسلسل دور ہوتے گئے۔ اسلام کا وہ کلمہ تقلیب انگیز اور ہماری فکر بے نیام جو کبھی حریتِ فکر، انسانی آزادی اور مساواتِ آدمیت سے عبارت تھی اور جس سے بچے دلوں کے چراغ جل اٹھتے تھے اس نے رفتہ رفتہ ایک قومی ایجنڈے کی حیثیت اختیار کر لی۔ پھر ہماری فکر بے نیام میں وہ قوت نہ رہی کہ غیر اقوام کے دلوں کو مسخر کرتی یا انہیں اپنا نجات دہندہ ہونے کا احساس دلاتی۔

تاریخ کے اس نازک لمحے میں جب ہماری فکر بے نیام کُند ہو چکی ہے، ہم خود کو اس پوزیشن میں محسوس نہیں کر سکتے کہ اقوامِ عالم کی نجات تو کجا خود اپنی حفاظت کا بھی سامان کر سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صدیوں پر مشتمل ہماری ملّی تاریخ میں ہر دور میں فکر و عمل کی درنگی کے لیے آوازیں اٹھتی رہی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا دور گزرا ہو جب ہمارے اندر اصلاحِ احوال کے لیے دین کی طرف واپسی کا نعرہ نہ لگایا گیا ہو یا قرآن کے نسخہ شفا کے استعمال کا مشورہ نہ دیا گیا ہو۔ البتہ عملی طور پر ہوا یہی ہے کہ دین کی طرف ہماری واپسی بڑی حد تک فقہی رسوم کی بازیافت سے عبارت رہی۔ وحیِ ربانی پر انسانی تعبیرات نے التباسات کی جو دیز دھند طاری کر رکھی تھی اس کے اسرار و عواقب کا صحیح اندازہ لگانے میں ہم سے سخت غلطی ہوتی رہی۔

آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے ہم اس بات کے سزاوار ہیں کہ دنیائے انسانیت کو راہ یاب کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں لیکن ایسا تب ہی ممکن ہے جب خود ہمارا فکری اور عملی وجود راست وحی ربانی سے غذا حاصل کرتا ہو۔ گویا وحی کی تجلیوں کی ازسرنو بازیافت کے بغیر ہماری اجتماعی تشکیل جدید ممکن نہیں اور ہماری اس تشکیل جدید کے بغیر اقوام عالم کی موجودہ بے سستی کا ازالہ بھی ممکن نہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر اور بالخصوص پندرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں مسلم انجمنوں کی چلت پھرت اور علماء و مشائخ کے پرزور خطبوں کے زیر اثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دنیا پر ایک نئی صبح طلوع ہونے کو ہے۔ ۱۹۷۹ء کا ایرانی انقلاب، افغانستان میں روس کی شکست، روسی استعمار کے بطن سے وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کی غیر متوقع بازیابی، یہ وہ عوامل تھے جس نے اہل فکر مسلمانوں کو بھی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیا۔ ہم صورتِ حال کا صحیح اندازہ لگانے اور اپنے فکر بے نیام کے کند ہو جانے کے احساس سے غافل رہے۔ ہمارے حوصلہ مند سیاسی قائدین بھی اگر زیادہ سے زیادہ کچھ سوچ سکے تو وہ اسی قدر کہ مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل معاشی، جغرافیائی یا سیاسی بلاک کس طرح تشکیل دیا جائے۔ اپنے تمام تر حسن نیت کے باوجود مسلم معاشرے میں دین کی واپسی کے حوالے سے کرنے والوں نے یہی کیا کہ وہ ایک خاص قسم کے فقہی نظام کو معاشرے پر جبراً نافذ کر دیں۔ نہ تو متحدہ مسلم بلاک کے نظریے میں یہ قوت تھی کہ وہ امت کو بنیان مرصوص میں تبدیل کر سکے اور نہ ہی فقہی یا مسلکی تعبیر ہماری شیرازہ بندی کا کام انجام دے سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی صحوہ اسلامیہ کے فلک شگاف نعروں کی ہوائِ نکلتی گئی۔ دین کی فقہی تعبیر جو خود اہل ایمان کے دوسرے گروہوں کو ساقط الاعتبار قرار دیتی تھی، بھلا دوسرے ادیان کے لیے نصیح خیر خواہی کے جذبے سے سرشار کیوں ہوتی؟ نتیجتاً ہم ایک طرح کے تہذیبی تصادم کی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔ نئی دنیا نے مسلمانوں کو مغرب کے اجنبی بلاد و امصار میں قیام کا جو غیر معمولی موقع فراہم کیا تھا، ہم حاملین وحی کی حیثیت سے اس کا خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ مغرب کے تہذیبی سمندر میں اسلامی مراکز کے نام پر ہم اپنے ثقافتی جزیرے تعمیر کرتے رہے۔ دین کی فقہی تعبیر دیگر تہذیبی حلقوں میں پائی جانے والی سعید روحوں پر بھی اپنے دروازے بند کرتی رہی۔ ﴿يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ﴾ (آل عمران: ۶۴) کی قرآنی پکار اسلامی بیداری کے ہنگاموں میں تحلیل ہو گئی۔ عملاً ہوا یہ کہ احیائے امت کے اس فقہی، مسلکی اور گروہی منہج نے گروہی تصادم کی راہ ہموار کی۔ صحوہ اسلامیہ کی ہماری سر توڑ جدوجہد نے ہمیں ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار کر دیا ہے جب ہم من حیث الامت ایک غیر پیغمبرانہ گروہی تصادم کو کفر و اسلام کی

جنگ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہم فجر جدید کے بجائے خود کو ایک صبح کاذب کے درمیان پاتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کے مابین موجودہ تصادم میں جہاں ایک منتشر اور تباہ حال امت کو بلکہ صحیح معنوں میں پوری انسانیت کو امریکی استعمار کے جارح عزائم کا سامنا ہے اور جہاں اسلام کو انارکی اور بے سمت دہشت گردی کا ہم معنی باور کرایا جا رہا ہے، ہمیں من حیث الامت اس خطرناک مہم کے دور رس اسرار و عواقب کا صحیح اندازہ بھی نہیں۔ ہمارے اسلامی ادارے، دینی علوم کی درس گاہیں، غور و فکر کے مؤثر حلقے چوں کہ اسلام کی مخصوص فقہی یا فکری تعبیر کی رہین منت ہیں اس لیے ان کے لیے اپنے فقہی دائرہ فکر سے باہر آ کر خالص وحی کی روشنی میں موجودہ صورت حال کا محاکمہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ عالم اسلام کے مختلف خطوں میں مختلف فقہی انداز فکر نے جس طرح دینی فکر پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی، اس کے نتیجے میں آج خود اہل اسلام باہم برسر پیکار نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں بیرونی خطرات کا مقابلہ کچھ آسان نہیں۔ ماضی میں اگر شیعہ سنی کے باہمی جھگڑے اور حنفی، شافعی کے مابین مسلسل ہونے والے خونی تصادم عباسی بغداد کے سقوط پر منبج ہوئے تھے تو آج بھی بیرونی حملہ آوروں کو ہمارا اندرونی تضاد اور انتشار مسلسل مکم پہنچا رہا ہے۔ ہمارے فقہاء جن کی ذہنی تربیت قرآن مجید کی آفاقیت کے بجائے فقہاء کے باہمی مناقشوں کی رہین منت ہے، وہ اس بات کا تصور کرنے سے عاجز ہیں کہ مسلکی اور فقہی تعبیر سے پرے خالص وحی کی بنیاد پر مسلم شناخت کی تشکیل ممکن ہے۔ مسلم حنیف کا براہیمی ماڈل عرصہ ہوا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

ہمارے زوال کی تلافی صرف ہمارا اندرونی مسئلہ نہیں۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے پوری انسانیت کا مستقبل ہم سے وابستہ ہے، اس لیے امت مسلمہ کے موجودہ انتشار اور اس کے فکری زوال کو نظر انداز کرنا دنیائے انسانیت کے لیے خطرناک مضمرات کا حامل ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے زوال پر بحث و مباحثہ کا حوصلہ پیدا کریں۔ اپنی طویل تہذیبی تاریخ اور فکری انحرافات کا وحی کی روشنی میں سخت محاسبہ کریں۔ جو امت صدیوں سے فقہی طریقہ فکر کی عادی ہے اور جس کے دل و دماغ کو علمائے متقدمین کی شخصیت نے مہبوت کر رکھا ہے اس کے لیے یقیناً یہ آسان نہیں کہ وہ صدیوں پر مشتمل اپنے تہذیبی اور علمی سرمایے پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ جہاں قال فلان اور روی فلان پر معاملات فیصل کرنے کا رواج ہو، وہاں ہر مسئلہ پر وحی ربانی کی روشنی میں اپنے دل و دماغ کو متحرک کرنے کی دعوت خواہ کتنی ہی معقول ہو اجنبی ضرور لگے گی۔ ہو سکتا ہے بعض لوگوں کو اس پر تجدید پسندی کا گمان ہو، لیکن جو لوگ قرآن مجید

میں رسول اللہؐ کے مقصد بعثت سے متعلق اس ارشاد سے واقف ہیں ﴿وَيُضْعِعُ عَنْهُمْ اَصْرَهُمُ وَالْاَغْلَالَ النِّسَى كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الأعراف: ۱۵۷) ان کے لیے اس نکتے کا ادراک مشکل نہیں کہ جس طرح قرآن مجیدؑ خدا اور بندے کے مابین کسی ربانیت یا پاپائیت کو قابل استزاد سمجھتا ہے، اسی طرح وہ مولویت کے ادارے کا بھی انکاری ہے۔ نہ تو تشریح و تعبیر پر کسی کی اجارہ داری ہے اور نہ ہی کسی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی کی صحیح العقیدگی پر شبہ وارد کرے۔ اہل ایمان کو تو چھوڑیے، اللہ تعالیٰ نے تو حلقہٴ اسلام سے باہر افراد کا فیصلہ بھی اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھا ہے: ﴿ان الله يفصل بينهم يوم القيامة﴾۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا، دائرہٴ وحی سے ہمارے باہر آ جانے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہم خیر امت کے منصب جلیل سے معزول ہو گئے، بلکہ پوری انسانی تاریخ جس کی آخری لمحے تک ہمیں قیادت کرنی تھی، سخت بحران سے دوچار ہو گئی۔ تاریخ کے اس سب سے بڑے انحراف کی درنگی کے لیے لازم ہے کہ ہم ان اسباب پر ایمان دارانہ غور و فکر کریں، جس نے ہمیں انسانیت کی قیادت سے ہٹا کر تاریخ کے dustbin میں ڈال دیا ہے۔

یاد رکھئے! جو لوگ خود کو آخری وحی کا حامل سمجھتے ہوں اور جو جذباتی طور پر اس احساس سے سرشار ہوں کہ انہیں تاریخ کے آخری لمحے تک اقوامِ عالم کی قیادت پر مامور کیا گیا ہے، وہ اگر رضا کارانہ طور پر اسی طرح تاریخ کے dustbin میں مزید پڑے رہے تو دنیا فتنہ و فساد سے بھر جائے گی۔ انسانی آزادی کا جو بگل مختلف انبیاء نے اپنے اپنے زمانے میں بجایا تھا اور جس کی بدولت آج ہمیں دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی آزادی اور اکرامِ آدمیت کی باتیں سننے کو ملتی ہیں، یہ تحریک رفتہ رفتہ دم توڑ دے گی۔ انسانی گردنوں کو اصر و اغلال سے نجات دلانے کے لیے محمدؐ رسول اللہ کی سعیِ تبلیغ پر ربانیت، پاپائیت اور مولویت پھر سے اپنی کمندیں ڈال دے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم موجودہ War on Terror کے اسرار و عواقب کا مقابلہ کرنے کے لیے، جہاں ایک بار پھر انسانی آزادی سخت خطرے میں گھر گئی ہے، فی الفور اپنے دل و دماغ کو حرکت دیں۔ تاریخ کے انحراف کو درست کیے بغیر اور امت مسلمہ کی دوبارہ تنصیب امامت کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ ہم پر وہ خواب آسا دنیا طلوع ہو، جہاں انسانوں کی گردنیں انسانوں کی دست درازی سے یکسر محفوظ ہوں۔ موجودہ شہری تہذیب میں جہاں فرد آزاد رہ کر بھی نظام کے ہاتھوں بندھوا مزدور بن گیا ہے، جہاں اس کے خون کا قطرہ قطرہ ٹیکس کی جبری مشین کو متحرک رکھنے میں صرف ہو رہا ہے، اس نامحسوس غلامی سے نجات کا کام بھی آخری وحی کے حاملین کو انجام دینا ہے۔



ہمیں نہیں معلوم کہ حاملِ قرآن ہونے کے واقعی مطالبات کیا ہیں۔ ہم قرآن مجید کی آفاقی دعوت کو فقہاء کی انسانی تعبیرات کا مماثل یا اس کا متبادل سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں لہذا دینی معاشرہ کے نام پر فی الفور ہمارے ذہنوں میں ایک ایسے معاشرے کا تصور ابھرتا ہے جہاں قدیم فقہاء کے دواوین اچانک قانون بن گئے ہوں۔ ہم جب تک انسانی تعبیرات کو وحی کا ہم پلہ سمجھتے رہیں گے اور جب تک راست وحی کے بجائے تعبیرات انسانی پر ہمارا انحصار باقی رہے گا دنیا کی کوئی قوت ہمارے جاری زوال پر روک نہیں لگا سکے گی۔

سلسلہ غور و فکر کی موت

دنیا پر امریکی استبدادی نظام کے استحکام کے ساتھ ہی ایک نئے امریکی اسلام کی آواز بھی سنائی دینے لگی ہے۔ بقول آیت اللہ خامنئی یہ ایک ایسے کمزور اور پسماندہ اسلام کی طرف دعوت ہے جو امریکی اصولوں کے ساتھ چلتا اور مغربی تصورات سے غذا حاصل کرتا ہے۔ خامنئی اور عالم اسلام کے دوسرے رہنماؤں کی تشویش یقیناً بجا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں ایسے خود ساختہ مسلم مسیحاؤں اور رہنماؤں کی گویا باڑھ سی آگئی ہے جو اسلام کو امریکی خارجہ پالیسی کی عینک سے دیکھنا پسند کرتے ہیں اور جو بڑی بے شرمی سے صدر بش کو مسلم دنیا کا مسیحا قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک، بلکہ کہنا چاہئے، ان کے لئے صدر بش حریت کے علمبردار ہیں جنگ کے نہیں۔ فی زمانہ امریکہ میں ایسے مسلمان بھی موجود ہیں جو خود کو اہل فکر سمجھتے ہیں اور ساری دنیا کو یہ باور کرانے پر تلے بیٹھے ہیں کہ عراق پر امریکی تسلط کے ذریعہ دراصل عرب دنیا میں تحریک اصلاح کے لئے راہ ہموار ہوگی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض نام نہاد مسلم دانشور امریکہ کے ساتھ امریکہ کے لئے جنگ میں شامل ہونے کو دینی فریضہ گردانتے ہیں اور برملا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ امریکی شہری کی حیثیت سے ان پر یہی کچھ فریضہ عائد ہوتا ہے۔ یہ تو رہی اسلام کے ایک ایسے نامانوس قالب کی بات جسے ہم امریکی اسلام سے تعبیر کرتے ہیں۔

البتہ عالم اسلام کے بڑے شہروں، مسلم ممالک کے دارالحکومتوں مثلاً ریاض، قاہرہ اور اسلام آباد میں امریکہ کے سلسلے میں جو جذبات پائے جاتے ہیں وہ بالکل ہی ایک دوسری کہانی سناتے ہیں۔ عالم اسلام میں امریکہ کو ایک بیرونی استبداد کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ عراق میں لڑی جارہی جنگ ظالم اور مظلوم کی جنگ ہے۔ بلکہ بعض تو اسے اسلام اور کفر کے درمیان معرکہ آرائی بتاتے

ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک انتہائی تکلیف دہ منظر نامہ ہے البتہ اس کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں اسے سیاہ و سفید کے خانے میں دیکھنا صورتِ حال کی صحیح تفہیم سے صرف نظر کرنا ہوگا۔ عراق کی موجودہ معرکہ آرائی میں جو لوگ امریکہ کے خلاف نبرد آزما ہیں ان میں اشتراکی بھی ہیں اور اسلام پسند بھی، عراقی قومیت کے علمبردار بھی ہیں اور وہ لوگ بھی جو اس بحرانی صورتِ حال کا فائدہ اٹھانے کے لئے پس پردہ سرگرم ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مختلف اور متضارب عناصر صرف اسلام کی خاطر سرگرم نہیں ہیں اور نہ ہی عراق کی موجودہ معرکہ آرائی کے وہ اہداف مقرر کئے گئے ہیں جو کسی ایسی مزاحمت کو خالصتاً جہاد فی سبیل اللہ کے دائرہ کار میں لے آئیں۔ قطع نظر اس کے کہ عراق کے مزاحم کار ایک مذہبی جہاد میں مشغول ہیں یا نہیں، گزشتہ دنوں سلفی اسلام کے نمائندوں نے اس بحث کو ایک فیصلہ کن فتویٰ سے سلجھانے کی کوشش کی ہے جس سے معاملہ کہیں زیادہ الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس فتویٰ کے مطابق عراق کی مدافعت میں امریکی حملہ آوروں کے ہاتھوں اپنی جان گوانا عین شہادت ہے۔ غیر وہابی سرکردہ علماء اور عالم اسلام کی دینی جماعتیں بھی جہاد عراق میں شرکت کا نعرہ بلند کرتی رہی ہیں۔ اس پس منظر میں اسلام کے عام قاری اور عام مسلم ذہن کے لئے یہ سمجھنا کچھ آسان نہیں رہتا کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی اسلام کے علمبردار، ایک ہی امت کے افراد امریکہ کی حمایت میں اس کے مفادات کے تحفظ کی جنگ لڑتے ہوئے عین اسلامی فریضہ انجام دے رہے ہوں اور جو لوگ ان کے ہاتھوں مارے جائیں یا جوان کے مزاحم ہوں وہ بھی اسی جذبہ اسلامی سے سرشار ہوں۔ امریکی اسلام کے علمبردار ہوں یا سلفی اسلام کے فتویٰ ساز ان دونوں کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ وہ نفس مسئلہ کا محاکمہ کرنے اور وحی ربانی کی روشنی میں کسی محکم فیصلہ پر پہنچنے کے بجائے ایک ایسی epistemology کے اسیر ہو گئے ہیں جس میں مباحثے، مکالمے اور مناقشے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ فتوے کی زبان میں کلام کے عادی حضرات اس بات کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ وہ کتاب و سنت سے اپنے نقطہ نظر کی صحت پر دلیل لائیں۔ مسائل پر محاکمے میں ان کا تمام تر انحصار مصالح امت پر ہوتا ہے جو بڑی حد تک ذاتی رجحانات اور انفرادی فہم و بصیرت سے غذا حاصل کرتا ہے۔ فتوے کی اس زبان نے امت مسلمہ کے تمام اہم امور پر داخلی بحث و تحقیق کے مواقع کو ختم کر دیا ہے۔ ہر گروہ اپنے فیصلہ کو finished product کے طور پر دیکھتا ہے جس کے از سر نو تحلیل و تجزیہ کی ضرورت اس کے نزدیک خود مذہب پر سوالیہ نشان لگانے کے مترادف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اندرون امت داخلی مباحثے کی موت نے ہمیں ایک بندگلی میں پہنچا دیا ہے جو ان

تمام بحرانوں سے کہیں بڑا بحران ہے جس سے آج ہم نبرد آزما ہیں۔ جنگیں اسلحوں سے ضرور لڑی جاتی ہیں اور یہ بھی لازم ہے کہ عزت نفس کی لڑائی لڑنے والے شوق شہادت اور ذوق عزیمت سے سرشار ہوں۔ لیکن اگر عین بحرانی لمحات میں بھی حالات کے نئے محاکے اور وحشی ربانی سے از سر نو اکتساب کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی تو کسی نئے راستے کی دریافت ممکن نہیں۔ علماء کے روایتی حلقے ہوں یا سیکولر تجدد پسندوں کے گروہ یہ سب کے سب ایک ایسے کلچر میں سانس لے رہے ہیں جہاں مکالمے کی صحت مندر روایت دم توڑ چکی ہے۔ سچ پوچھئے تو اسلام کو اقوام عالم کا ایجنڈا بنانے میں اس مفتیانہ ذہن نے سد سکندری کھڑا کر رکھا ہے۔

ایوب خاں کے پاکستان میں جب اس سوال نے سر اٹھایا تھا کہ پاکستان میں نافذ ہونے والا اسلام آخر کس فرقے کی عکاسی کرے گا۔ چار ائمہ فقہاء، اہل تشیع یا غیر مقلدین میں سے کس کے اسلام کو ریاست کا مذہب بنایا جائے گا تو اس وقت علماء اسلام نے اس سوال میں پوشیدہ بھیا تک زیریں خطروں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہہ کر اس سوال سے جان چھڑانے کی کوشش کی کہ اکثریت کی فقہ کو سرکاری سرپرستی حاصل ہونی چاہئے اور چونکہ پاکستان میں اکثریت حنفی فقہ کے علمبرداروں کو حاصل تھی اس لئے ریاست پر حنفی اسلام کا اسلام کے دوسرے قابلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حق تھا۔ البتہ یہ بات عمداً نظر انداز کر دی گئی کہ جو لوگ اپنے اپنے مسلکوں کو احق تسلیم کرتے آئے ہیں ان کی احق فقہ کو صرف تعداد کی کمی کی بنیاد پر کالعدم یا معطل قرار دیا جانا قرین انصاف نہیں ہو سکتا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی نئی ریاست ان تمام متضادم اور متخارب فقہی دہشتانوں کے از سر نو تحلیل و تجزیہ کا عزم کرتی اور نئے عہد کے تقاضوں کے پیش نظر قرآن مجید کی روشنی میں ان دہشتانوں سے اخذ و استراد کا فیصلہ کرتی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اسلام کی ایک نئی جگمگاتی تصویر دنیا کے سامنے آ سکتی تھی۔ لیکن جو لوگ ایک ایسی روایت کے اسیر ہوں جہاں مباحثے کی موت ہو چکی ہو، جہاں تمام ہی مسائل کا قطعی اور حتمی جواب قدیم فقہاء کے دہشتانوں سے برآمد کرنے پر زور ہو بھلا ایک ایسی روایت کے حاملین مدت سے بند دریچوں کو کھولنے کی جرأت کیسے کر سکتے تھے۔

قرآن ایک جاری اور continuing discourse ہے۔ امر ربی کے جلو میں یہاں اس بات کی مسلسل دعوت دی جا رہی ہے کہ اہل ایمان غور و فکر اور تحلیل و تجزیہ کا سلسلہ دراز رکھیں۔ یسألونک کے جواب میں فُل کی تکرار اس بات سے عبارت ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو فتاویٰ طرز فکر کا اسیر بنانا نہیں چاہتا۔ جو لوگ اپنے دل و دماغ پر تالے ڈال لیتے ہیں ﴿إِنَّمَا عَلَى قُلُوبِ أَفْصَالِهَا﴾ (محمد: ۲۴) یا

جو لوگ آنکھ، کان اور زبان رکھ کر بھی ان سے کام نہیں لیتے یا جو مسائل کی روایتی تفہیم پر جم جاتے ہیں ﴿وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ (الشعراء: ۷۴) وہ بالآخر جوہر حق شناسی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے قرآن چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے تحلیل و تجزیے اور غور و فکر کا سلسلہ مسلسل جاری رکھیں۔ حتیٰ کہ ایمان لانے کے بعد بھی جستجو کی یہ منزل تمام نہیں ہوتی۔ کائنات پر غور و فکر اہل ایمان کے دلوں کو خشیت سے مامور کرتی، انہیں اہل علم کے منصب پر فائز کرتی ﴿انما يحشي الله من عباده العلماء﴾ (فاطر: ۲۸) اور زندگی کے بحرانی لحاظ میں ہمت ہارنے یا شکست تسلیم کرنے کے بجائے ان پر اس راز سے پردہ اٹھاتی ہے کہ بڑی کامیابی کے حصول کے لئے ابتلاء و آزمائش کے جانکسل مراحل سے گزرنا ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ وہ قیادت عالم کے منصب کے سزاوار سمجھے جائیں۔ غور و فکر، تدبر و تعقل کی دعوت مسلسل سے عبارت یہ کتاب حیرت ہے کہ جس امت کے درمیان موجود ہے خود اس کے اندر ایک صحت مند مباحثے کی موت ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا اس کا شافی جواب اس مباحثے کی ابتداء کے بغیر ممکن نہیں: ﴿ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما ياتكم مثل الذين خلوا من قبلكم مستهم البأساء والضراء وزلزلوا حتى يقول الرسول والذين آمنوا معه متى نصر الله ألا ان نصر الله قريب﴾ (البقرہ: ۲۱۴)۔

اسلام کے یہ مختلف قالب جو ایک دوسرے سے باہم متضاد نظر آتے ہیں اور جس کی وجہ سے یہ امت تفرقے کے عذاب میں جینے پر مجبور ہے، دراصل وحی کی جامد تفہیم کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید کے بہتے آبشار کے گرد فقہاء و مفسرین کی تعمیر کردہ دیواریں، مورخین اور روایت سازوں کے ذریعہ فراہم کیا جانے والا تاریخی تناظر اور سب سے بڑھ کر یہ خیال کہ سلف صالحین کا انسانی فہم المتباسات سے ماورا وحی جیسے تقدس کا حامل ہے، وہ عوامل ہیں جس نے وحی جیسی sublime شے سے اخذ و اکتساب کے سلسلے میں ہمیں یہ باور کرا رکھا ہے گویا یہاں دماغ کے استعمال کی کوئی ضرورت نہیں۔ وحی کے آبشار سے ہمارا راست رابطہ منقطع ہو جانے سے ہوا یہ ہے کہ ہم خود کو راست اس کا مخاطب نہیں پاتے۔ وحی کو خود respond کرنے کے بجائے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ قدامت نے اسے کیسے respond کیا۔ اس طرح کتاب ہدایت کی اتباع میں ہمارا ہر قدم دراصل سلف صالحین کی اتباع پر منتج ہو جاتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ یہیں نہیں رکتا، ہر شخص کے اپنے اپنے پسندیدہ سلف صالحین ہیں جن کی اتباع کو وہ جزو دین جانتا ہے اور اس کا دامن تھام لینے کو غایت دین قرار دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج امت کی مذہبی زندگی قرآن کے بجائے مختلف قسم

کے سلف صالحین کے گرد گردش کرنے پر مجبور ہے۔ نسلا بعد نسل اس سلسلہ تقلید نے نہ صرف یہ کہ ہمیں اصل ماخذ وحی سے دور کر دیا ہے بلکہ دین کے نام پر ہم بڑی حد تک قدامت کی فہم کے تابع آراء الرجال کے اسیر ہو گئے ہیں۔

امت مسلمہ جو بلاشبہ تمام انبیائے سابقین کی دعوتوں کا ارتکاز ہے اور جسے آخری نبی محمد رسول اللہ کی قیادت میں اقوام عالم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے، ایک ایسی عالمگیر امت میں اگر فہم دین کے نام پر حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی جیسے مستقل خیمے وجود میں آجائیں اور دین کی ان تعبیروں کو حتمی اور غیر زمانی حیثیت حاصل ہو جائے تو یہی سمجھنا چاہئے کہ غور و فکر کی صحت مندر روایت اب ہمارے درمیان ختم ہو گئی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ کسی مخصوص عہد کے علماء کو رہتی دنیا تک کے لیے لائق اتباع سمجھا جائے۔

نویں صدی ہجری میں چار مسلک کو مستقلاً تسلیم کئے جانے اور اسے حکومت کی باقاعدہ سرپرستی مل جانے کے بعد سے اب تک ہم رفع فتنہ کی خاطر یہی کہتے آئے ہیں کہ چاروں مسلک حق پر ہیں ان میں سے کسی ایک کی پیروی بھی اتباع دین قرار پائے گی۔ لیکن اب تک ہم اس سوال کا شافی جواب نہیں دے سکے ہیں کہ جب چاروں ائمہ کا ماخذ ایک ہی قرآن ہے تو پھر ان کے جوابات میں بسا اوقات اتنا اختلاف کیوں واقع ہو جاتا ہے کہ نماز جیسی اجتماعی عبادت بھی مشترکہ طور پر ادا کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ اگر چار ائمہ تشریح و تعبیر کا یہ غیر معمولی حق رکھتے ہیں تو پانچویں، چھٹے یا بعد کے عہد میں آنے والے دوسرے اہل علم اور خدا ترس علماء سے یہ حق کیوں چھینا جاسکتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں محمد بن عبدالوہاب کی دعوت اصلاح سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ صحت مند غور و فکر کی روایت کا شاید دوبارہ احیاء ہو سکے گا۔ حنبلی خیمے سے اٹھنے والی اس دعوت انقلاب نے آگے چل کر اتنا تو ضرور کیا کہ حرمِ مکہ میں چاروں ائمہ کی الگ الگ نمازیں بند ہو گئیں۔ عالم اسلام کے لئے سلفی اسلام کے اس تحفے کی یقیناً تحسین ہونی چاہئے البتہ ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کے متبعین میں بھی عدم تقلید کے نام پر اسلام کی ایک ایسی تعبیر کو احق تسلیم کرنے پر اصرار جاری رہا جس کا سر محمد بن عبدالوہاب سے ہوتا ہوا محمد بن حنبل پر ٹوٹ جاتا تھا۔ بیسویں صدی میں چلائی جانے والی پرشور دینی تحریکوں نے بھی ان خیموں کے اتحاد یا اختلاف کی بڑی کوشش کی لیکن یہ تمام کوششیں اتحاد اسلامی کے وقتی مظاہر سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ ایسا اس لئے کہ معلوم، مدون اور طے شدہ جواب کو از سر نو چیلنج کرنا، وحی کی روشنی میں اس کا تنقیدی محاکمہ کرنا اور راست اکتساب کی فراموش گزرگاہ پر از سر نو چلنا اتنا وسیع علمی چیلنج ہے جس کے لئے ہمت جٹانا کچھ

آسان نہ تھا۔

مباحثے کے فقدان اور قرآن مجید کو محورِ فکر سے ہٹا دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اکیسویں صدی میں امت مسلمہ نوے، دسویں صدی کی فقہی دنیا میں جینے پر مجبور ہے۔ مذہبی زندگی کی قیادت ان افراد کے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے جو اپنی اپنی قبروں میں صدیوں سے آرام فرما رہے ہیں اور جنہیں یقیناً اکیسویں صدی کے حالات سے ناواقفیت کے لئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ صدیاں گزر گئیں امت زندہ چلتی پھرتی قیادت اور زندہ ذہن و فکر سے محروم ہے۔ یہ ہے وہ صورتِ حال جس کی شکایت خدا کی کتاب اپنے حاملین سے کر رہی ہے ﴿يَا رِبِ انْ قَوْمِ اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا﴾ (الفرقان: ۳۰)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”لوگو خدا تمہیں اس کتاب کے ذریعے سر بلند کرے گا“۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ اس کتاب کے حاملین صدیوں سے مسلسل زوال کا شکار ہیں۔ یہ وہ سوال ہے جس پر اس وقت تک غور کیا جانا چاہیے جب تک اس سوال میں پوشیدہ رموز کا پتہ نہ لگ جائے۔ قرآن کی تلاوت، اس کی تحفیظ اور نشر و اشاعت میں یہ امت بھلا کب پیچھے ہے۔ اس بارے میں دنیا کی کوئی قوم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کے باوجود ہم ایک زوال پذیر قوم ہیں ایسا اس لئے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ حامل قرآن ہونے کے واقعی مطالبات کیا ہیں۔ چونکہ ہم نے بالعموم تعبیراتی ادب اور فقہی سرمائے کو قرآن کا مماثل بلکہ اس کا کشید کیا ہوا عطر قرار دے رکھا ہے اس لئے ہم تمسک بالقرآن کے حوالے سے ان کتابوں سے چٹے رہنے کو کافی سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں کہ اس عمل سے رفتہ رفتہ ہم اصل کتاب سے کتنی دور جا پڑے ہیں۔ ہم قرآن مجید کی آفاقی دعوت کو فقہاء کی انسانی تعبیرات کا مماثل یا اس کا متبادل سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں لہذا دینی معاشرہ کے نام پر فی الفور ہمارے ذہنوں میں ایک ایسے معاشرے کا تصور ابھرتا ہے جہاں قدیم فقہاء کے دواوین اچانک قانون بن گئے ہوں۔ ہم جب تک انسانی تعبیرات کو وحی کا ہم پلہ سمجھتے رہیں گے اور جب تک راست وحی کے بجائے تعبیرات انسانی پر ہمارا انحصار باقی رہے گا دنیا کی کوئی قوت ہمارے جاری زوال پر روک نہیں لگا سکے گی۔

قرآن مجید آج بھی ہمارے لئے سر بلندی کا زینہ بن سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کی آفاقی دعوت سے خود کو ہم آہنگ کر سکیں اور ہمارے اندرونی کے چیلنج کو قبول کرنے کا یارا ہو۔ قرآن مجید تمام دنیائے انسانیت کے لئے ایک کھلی دعوت ہے یہ ایک ایسی کتاب ہے جو بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل تمام انسانوں کو اپنے سایہ عاطفت میں پناہ دینا چاہتی ہے۔ یہ ہمیں وسیع النظری اور وسیع القسی کی تعلیم

دیتی ہے۔ جو قومیں اس وقت دنیا میں غالب ہیں ان کی سر بلندی کا راز بھی قرآن مجید میں بتائے گئے ان ہی رموز میں پوشیدہ ہے گو کہ وہ خود بھی اس راز سے واقف نہیں۔ ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی اس سر زمین پر توحید کی انبیائی تحریکیں چلتی رہی ہیں جن کی باقیات آج بھی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں اور جن کی تحریف شدہ کتابوں کے بارے میں بھی قرآن مجید کا یہ بیان موجود ہے کہ وہ رہنمائی اور روشنی سے نری خالی نہیں۔ گمراہ قومیں واقعہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی بہ نسبت گزشتہ چند صدیوں میں کہیں زیادہ وسیع القسمی کی حامل دکھائی دیتی ہیں اور ہم قرآن مجید کے حاملین ہونے کے باوجود من حیث الامت اپنے اندر اس آفاقی مزاج کو پیدا کرنے میں سخت ناکام ہیں جس میں گم شدہ انسانیت ہمارے سایہ عاطفت میں جینے کو ترجیح دے بلکہ اس کے برعکس ہماری تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا حال یہ ہے کہ ہمیں جب ایک چھوٹے سے خطے میں اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہاں غیر مسلموں کو تو چھوڑیے خود دوسرے فرقے کے مسلمانوں کو زندگی جینے کا برابر حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

طالبان کا سقوط گو کہ عامۃ المسلمین کے لئے ایک انتہائی تکلیف دہ لمحہ تھا لیکن ایک ایسی ریاست جو قرآن کی آفاقیات سے منھ موڑ کر مسلکی اور فقہی تنگ نظری پر اٹھائی گئی ہو وہ قوانین فطرت کے مطابق زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ لوگ جو اپنے ہی بھائیوں اور بہنوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر انہیں اقوام عالم کی قیادت کی ذمہ داری کیسے دی جاسکتی ہے؟ جب تک مسلمان قرآنی معاشرے کے قیام کے لیے فقہاء و متقدمین پر کاملاً انحصار کرتے رہیں گے تب تک ہماری سر بلندی کی ہر خواہش ایک سراب ثابت ہوگی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآنی دائرہ فکر کے اساسی جوہر کا از سر نو ادراک کیا جائے۔ حاملین قرآن کی حیثیت سے یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس نظام انصاف کے قیام کی دنیا کو دعوت دیں جس میں اخوت، بھائی چارگی، حریت فکری، رواداری اور ایک ایسی پیغمبرانہ وسعت قلبی اور ہمہ دم نصیح و خیر خواہی کا ماحول پایا جاتا ہو جس کی تفصیلات اور بشارت سے قرآن کے صفحات پُر ہیں۔ قرآنی دائرہ فکر میں ہماری کاملاً واپسی کے بغیر ”اسلام ہی حل ہے“ جیسے فلک شگاف نعرے zombified محسوس ہوں گے اور مسلمان ایک ایسی جامد قوم (fossilized nation) کے طور پر دیکھے جاتے رہیں گے جہاں سلسلہ غور و فکر کی موت ہو چکی ہو۔



مسلمانوں کا قومی اسلام، صدیوں اسلام کی آفاقیت سے مزاحم ہوتا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو شاید خلاف واقعہ نہ ہو کہ دین کی اس خالص تہذیبی تعبیر نے صدیوں سے اسلام کی آفاقیت کو شکست دے رکھا ہے۔ فی زمانہ ان فتوؤں پر کسے اب یقین آئے گا کہ غیر عربی طرز کے لباس پہننا یا غیر عربی انداز سے بالوں کا تراشوانا حرام ہے یا یہ کہ فارسی زبان کا سیکھنا (جس میں اب انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری غیر عرب زبانوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے) من تشبہ کی رو سے حرام ہے۔ اب کون اس بات پر یقین کرے گا کہ انگریزی زبان منافق بناتی ہے؟ اور کون اس فتوے کو معتبر سمجھے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص بروز حشر مشرکوں میں اٹھایا جائے گا؟ کیا اہل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیہ کی طرح اس عقیدے کا متحمل ہو سکتا ہے کہ جنس عرب جنس عجم سے افضل ہے؟

مستقبل اسلامی کی تلاش

جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے
جب نوزائیدہ زندہ درگور بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی
جب صحیفوں کی نشر و اشاعت کی کثرت ہوگی
جب جنت قریب لے آئی جائے گی
تب ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ وہ اپنے لئے کیا لایا ہے۔
(تکویر: ۱۴۷)

سورۃ تکویر کی ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن بر ملا سائبر اسپیس کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو قرآن مجید جس ذات باری کا کلام ہے وہ زمان و مکان کے فرق سے ماوراء چیزوں کو اس کی اصل ماہیت کے ساتھ اس طرح دکھاتا ہے گویا ازل تا ابد بجلی کی ایک چمک اور بصیرت کی ایک رعد کے ساتھ سب کچھ اچانک ایک لمحے کے لئے منور ہو گیا ہو۔

عام انسانی دنیا سے ماوراء ایک ایسے virtual world کا وجود میں آ جانا جہاں کروڑ ہا کروڑ نفوس ایک دوسرے سے بحث و مباحثہ اور باہمی استفادے میں مشغول ہوں، ایک حیرت ناک وقوعے سے کم نہیں۔ عالم محسوسات سے پرے ایک ایسی اضافی دنیا کا وجود جو مسلسل ہماری زمینی زندگی کو متاثر کر رہی ہو، اب ایک ایسی حقیقت ہے جسے مزید نظر انداز کرنا اب ماضی پرست قوموں کے لئے بھی ممکن نہیں رہا۔ صحیفوں کی نشر و اشاعت کا یہ عالم ہے کہ جس موضوع پر بھی بٹن دبائے معلومات کا ایک لامتناہی سمندر موجود

ہے۔ ہر قسم کے افکار و خیالات اپنی تمام تر خباثتوں اور سعادتوں کے ساتھ قاری کے منتظر ہیں۔ انٹرنیٹ کی اس virtual دنیا میں نہ کوئی محتسب مؤثر رہ گیا ہے اور نہ ہی کسی خیال کو محض قوت کی بنیاد پر دبا ڈالنا ممکن ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس سائبر دنیا کا نہ کوئی مرکز ہے اور نہ ہی کسی خاص تہذیب یا عسکری قوت کی اس دنیا پر اجارہ داری ممکن رہ گئی ہے۔ گویا Cyber Space ایک ایسی پوسٹ ماڈرن دنیا کی ایک جھلک ہے جہاں خیالات کو محض اس کی حقیقی قدر و قیمت کی بنیاد پر قبول یا رد کیا جانا ممکن ہو سکے گا۔ اب انسانی دل و دماغ کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ مولوی یا محتسب کی چیرہ دستیوں سے یکسر آزاد ہو کر تہذیبی اور قومی سطح سے اوپر اٹھ کر اللہ کے عطا کردہ قلبِ سلیم کو حتی المقدور استعمال میں لائے اور پھر اپنی صوابدید پر، عقل و نظر کی روشنی میں اپنے لئے ایک بہتر راستے کا انتخاب کر سکے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں شیطان کے وساوس بھی ہیں اور خدا ترسوں کی دردمند رہنمائی بھی۔ فقہاء و مشائخ کے طئے کردہ حتمی جواب بھی ہیں اور وحی ربانی کو سمجھنے کیلئے خود اپنے دل و دماغ کو متحرک کرنے کی دعوت بھی۔ اگر ایک طرف مختلف نظریات کا اپنا اپنا مسور کن پروپیگنڈہ ہے تو دوسری طرف اس کے رد میں بھی کم مضبوط دلائل نہیں۔ گویا ﴿اذلّٰ الصّٰحفٰ نشرت﴾ کا غلغلہ ہر طرف بلند ہے۔ واشنگٹن کے پراسٹائن سٹ میں بیٹھنے والا انسان ہو یا افغانستان کے نامعلوم پہاڑی سلسلوں میں بسنے والا شخص، انٹرنیٹ کی دنیا میں دونوں برابر کا شریک ہے۔

دیکھا جائے تو انسانی تاریخ میں فکر و نظر کی آزادی کا اتنا وافر امکان پہلے کبھی نہ تھا۔ قلب و نظر کو جلا بخشنے کیلئے جس ذہنی افق اور بین الاقوامی مباحثے کی ضرورت تھی، اس کا ماحول تیار ہو چکا ہے۔ اس نئی صورتحال نے روایتی علماء کے قیل و قال سے پردے، فرقہ وارانہ تعبیر اور مسلکی تشریحات سے ماوراء، ایک ایسے ہمہ گیر مباحثے کی بناء ڈال دی ہے جس کے بطن سے فی زمانہ دینِ خالص کے طلوع ہونے کے امکانات وا ہو گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں فکر و نظر کی بے مہار آزادی ہمیں ایسے سطحی اور junk مباحثے میں بھی الجھا سکتی ہے جس سے ہماری موجودہ پریشاں خیالی میں مزید اضافہ ہو جائے۔ Information کے اس سیلاب میں disinformation کے ریلے بھی بہہ رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ تو بہر حال کرنا ہوگا۔ دودھ کو پانی سے اور حق کو باطل سے ممیز کئے بغیر ہماری منزل بامراد نہ ہوگی۔ البتہ جو لوگ وحی کی روشنی کو اپنی مشعل راہ بنانے کا عزم رکھتے ہوں ان کے لئے عمومی کنفیوژن کی اس فضا میں راستہ بنانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم سائبر ورلڈ میں کسی نئے اسلام کے ظہور کے منتظر یا اس کے لئے

کوشاں ہیں۔ دین خالص وحی ربانی کو ایک ایسی صورت حال میں پیش کرنے سے عبارت ہے جب زمان و مکان یا تہذیبی مظاہر کا پرتو وحی ربانی پر تقریباً معدوم ہو گیا ہو۔ خدا کا دین بندوں کی اس سائبر دنیا میں کچھ اس طرح جلوہ فگن ہو گیا وہ تمام انسانوں کو شمولیت کی یکساں دعوت دے رہا ہو۔ نہ وہ مشرق کا پرستار ہو نہ مغرب کا مخالف، نہ اسے عربوں سے کوئی خاص انسیت ہو نہ عجمیوں سے کسی درجے کی خاصیت، نہ وہ ایشیاء والوں کا دین سمجھا جاتا ہو اور نہ کسی ایسے خاص تہذیبی قالب کا حامل کہ اہل مغرب اسے Middle-Eastern Religion قرار دیتے ہوں، گویا ایک ایسا اسلام جس کی مکمل تصویر قرآن مجید کے دفتین میں پائی جاتی ہو اور جسے سمجھنے کیلئے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ یا اموی، عباسی جاہ و حشم کے بیان کی چنداں ضرورت نہ ہو اور نہ ہی مسلم اسپین، مغل دہلی اور عثمانی ترکوں کی تہذیبی تاریخ کا اس پر پڑ پڑا یا جاتا ہو۔ ایک ایسا اسلام جو تمام انسانیت کا نجات دہندہ ہو اور جس کے غلبے کی دعوت کسی خاص قوم کے تہذیبی غلبہ کی نفی سے عبارت ہو۔ محمد رسول اللہ جو کہ کافۃ للناس بشیرا و نذیرا ہیں اور جن کی رحمۃ للعالمین پر قرآن کے صفحات گواہ ہیں، ان کی دعوت لا الہ الا اللہ کی منطقی انتہا ایک ایسے ہی منظر نامے کی طالب ہے جب تمام مسلکی مظاہر سے اوپر اٹھ کر عالمی سطح پر انسانوں کو خدائے واحد کی بندگی میں مربوط کر دیا جائے۔ ایک ایسے غیر تہذیبی اسلام کے ظہور کیلئے سائبر دنیا سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟

روایتی مسلم ذہن کیلئے سائبر ورلڈ نئے چیلنجز کی آماجگاہ ہے۔ قدیم فقہی اصطلاحوں کا یہاں سرے سے اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ سائبر ورلڈ میں دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاحیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں، یہاں نہ کوئی centre ہے اور نہ periphery - بیک نظر مجموعی طور پر اس دنیا میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ امکانات کے اس سمندر سے فرد پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کوزے میں کیا کچھ تو شہ جمع کرتا ہے۔ کل تک جو لوگ دنیا کو تہذیبی اکائیوں میں منقسم دیکھنے کے عادی تھے، یا جو محمد رسول اللہ کے آفاقی پیغام کو عرب تہذیب میں محدود کئے دینے کے قائل تھے، یا جو یہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ عرب تہذیبی مظاہر ہی دین اسلام کی واحد مستند شکل ہیں، ان کے لئے یقیناً اس نئی صورتحال کو سمجھنا مشکل ہوگا کہ کس طرح سائبر ورلڈ میں اسلام کا آفاقی پیغام، اپنے قدیم عربی قالب سے ماوراء، تمام انسانوں کیلئے یکساں توجہ اور کشش کا باعث بن رہا ہے۔ ہمارے زوال کے عہد میں تحفظ اسلامی کی خاطر عرب تہذیبی مظاہر پر غیر ضروری اصرار کی جو لئے اپنے اپنے زمانے میں ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے یہاں غیر معمولی طور پر بلند ہوتی گئی تھی اور جس کے نتیجے میں اسلام کو عرب مشرقی ورثے کے طور پر دیکھنے کا رواج عام ہوا، التباسات کی یہ دھند بھی

اب چھٹنے کو ہے۔ ﴿اذ النفوس زوجت﴾ کی عمومی فضا میں اب ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ آفاقی نبی کی امت کسی ایک تہذیبی مظاہر، جغرافیائی ماحول اور اس سے متاثر لباس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اب بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص زبان سے اسلام کو نفرت ہے یا کوئی خاص لباس غیر قوموں کا لباس ہے جس کے پہننے سے اسلام رخصت ہو جاتا ہے تو اس کا یہ سمجھنا ایک بین الاقوامی پیغمبر کی آفاقیت کو مشتبہ کر دیتا ہے۔ من تشبہ بقوم فهو منهم کی فرضی حدیث اور اس کی خیالی تعبیرات نے صدیوں سے اسلام کو ایک عرب تہذیبی اکائی کے طور پر متعارف کرارکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکائی فاصلوں کے سکڑنے کی وجہ سے اب یہ مفروضات خود بخود ختم ہو رہے ہیں۔ کل تک جو بات فقہائے حنابلہ، فقہائے احناف کیلئے سمجھنا مشکل تھی اور جس کی وجہ سے تہذیبی مظاہر کی بنیاد پر کفر و اسلام کے فتوے صادر کرنے کا رواج عام تھا آج وہی بات نئی سکڑتی دنیا میں قرآن کے معمولی طالب علم کے لئے بھی سمجھنا آسان ہو گئی ہے کہ تہذیبی مظاہر یا لباس کی بنیاد پر کفر و اسلام کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ ابن تیمیہ کا یہ فہم جس کا شدید اظہار انہوں نے اقتضاء صراط المستقیم فی مخالفہ اصحاب النجم میں کیا ہے اور اس قبیل کے دیگر علماء کا قومی اسلام، صدیوں اسلام کی آفاقیت سے مزاحم ہوتا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو کچھ خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ دین کی اس خالص تہذیبی تعبیر نے صدیوں سے اسلام کی آفاقیت کو شکست دے رکھا ہے۔ ﴿اذ النفوس زوجت﴾ کے موجودہ ماحول میں اب ان فتوؤں پر کسے یقین آئے گا کہ غیر عربی طرز کے لباس پہننا یا غیر عربی انداز سے بالوں کا تراشونا حرام ہے یا یہ کہ فارسی زبان کا سیکھنا (جس میں اب انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری غیر عرب زبانوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے) من تشبہ کی رو سے حرام ہے۔ اب کون اس بات پر یقین کرے گا کہ انگریزی زبان منافق بناتی ہے؟ اور کون اس فتوے کو معتبر سمجھے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص بروز حشر مشرکوں میں اٹھایا جائے گا؟ کیا اہل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیہ کی طرح اس عقیدے کا متحمل ہو سکتا ہے کہ جنس عرب جنس عجم سے افضل ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی خالص قومی اور تہذیبی تعبیر نے ایک آفاقی دین کو نہ صرف یہ کہ ایک عرب مشرقی ورثے کی حیثیت دے دی بلکہ آنے والے دنوں میں حاملین قرآن کیلئے خالص قومی بنیادوں پر مسابقت کی طرح بھی ڈال دی۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی عالمی غلبہ کا خواب دیکھنے لگے۔ پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے غلبہ اسلام کی جو امید بندھی تھی اس سے غیر تو یہ سمجھتے ہی تھے کہ مسلم قوم ایک بار پھر دنیا پر اپنے سیاسی غلبہ کا خواب دیکھ رہی ہے، خود مسلم ذہنوں

میں بھی اسلامی صدی کا مفہوم اس سے کچھ مختلف نہ تھا کہ صدیوں سے جو قوم مسلسل پسپائی اختیار کرتے ہوئے تاریخ کے حاشیے پر چلی گئی ہے وہ ایک بار پھر دنیا پر غالب ہونے کو ہے۔ قومی اسلام کے اس تصور نے دوسری قوموں کی طرح اہل اسلام کو بھی مسابقت کی اس دوڑ میں مبتلا کر دیا۔ اہل یہود جن کا دعویٰ ہے کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی موثر ترین سرگرمیوں کی وجہ سے اکیسویں صدی کی قیادت کے سب سے زیادہ سزاوار ہیں یا مغرب کی بعض اقوام خصوصاً امریکہ جو اکیسویں صدی پر مکمل غلبہ کو اپنا حق سمجھتا ہے، اسی طرح مسلم ذہنوں میں بھی قومی اسلام کے زیر اثر یہ خیال پرورش پاتا رہا ہے کہ پندرہویں صدی ہجری یا اکیسویں صدی عیسوی آخر مسلمانوں کے غلبہ و استیلاء کی صدی کیوں نہ ہو؟۔ افغانستان میں سوویت یونین کی شکست کے بعد مجاہدین کی جواں سال قیادت کے ذہنوں میں فطری طور پر اس خیال نے انگڑائی لی کہ سوویت یونین کے زوال کے بعد اب ان کا منطقی وظیفہ یہ رہ گیا ہے کہ وہ امریکہ کے خلاف اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دیں۔ ان کے نزدیک مغرب پر مشرق کی فتح کا بھی ایک واضح اور آسان راستہ تھا۔ اس میں شبہ نہیں بن لادن اور دوسرے عرب مجاہدین کو اس تہذیبی ٹکراؤ کی راہ پر ڈالنے والے دوسرے عناصر بھی تھے البتہ مغرب کے مقابلے میں ایک مشرقی اور قومی اسلام کی فتح کا داعیہ ان کے دل و دماغ کو مسلسل ہمیز کرتا رہا ہے۔ تہذیبی اسلام کا یہ مروجہ قالب جو عرب مشرقی ثقافت کو اسلام کا لازمی جز قرار دیتے بیٹھا ہے، نفسیاتی طور پر اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسری تہذیب کی سعید اور صالح روحوں کو بھی غلبہ اسلام کے منصوبے میں شامل کر سکے یا یہ کہ اسلام کو ایک ایسے ہمہ گیر بین الاقوامی قالب میں مختصر دیکھے جہاں تہذیبوں کے بجائے صرف وحی ربانی کی بنیاد پر ایک نئی دنیا کی تعمیر کا منصوبہ پایا جاتا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مروجہ تہذیبی اسلام نے مسلم نوجوانوں کے ذہنوں سے اسلام کی آفاقیت اور تمام ہی اقوام و ملل کیلئے نصیح و خیر خواہی، ہمدردی و غم گساری جیسے جذبات کو دور کر رکھا ہے جو داعی کا بنیادی وصف ہے۔ اسلام کو اس محدود تہذیبی خول سے نجات دلانے اور اسے پیغمبرانہ آفاقی پیغام کی حیثیت سے پیش کرنے کیلئے ہمیں اپنے تہذیبی اور علمی ورثے کے سخت احتساب کی ضرورت ہوگی۔ اندیشہ ہے کہ اس عمل میں بڑے بڑے شارحین اور علمائے عظام کا اعتبار ساقط ہو جائے۔ جو لوگ بعض اصحاب سلف کو یا اپنی پسند کے ائمہ و فقہاء کو قرآن مجید کی شاہ کلید قرار دیتے آئے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کے بغیر فہم قرآن کا قفل نہیں کھل سکتا، ان کے لئے اس صورتِ حال کا ادراک یقیناً مشکل ہوگا۔ صدیوں سے جو لوگ اسلامی فلسفہ، اسلامی آرٹ، اسلامی فنونِ لطیفہ اور اسلامی طرزِ تعمیر جیسی اصطلاحوں میں کلام کرتے رہے ہیں، ان کو یہ باور کرانا کچھ

آسان نہ ہوگا کہ عباسی بغداد کا فنونِ لطیفہ، مسلم اسپین کا سائنسی عروج، اور مغل سلطنت کے تاج محل یا لال قلعہ کے لافانی نقوش، جن کو مسلمان اپنی تہذیبی تاریخ کے سنگ میل کے طور پر پیش کرتے ہیں دراصل ہم ان تمام کاموں کیلئے مامور ہی نہیں کئے گئے تھے۔ قومی افتخار کی ان تمام علامتوں کا کارِ نبوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ رہا علم و حکمت اور علوم و فنون کی ترقی تو یہ کسی قوم کی میراث کبھی نہیں سمجھے گئے۔ یہ نوعِ انسانی کا مشترکہ ورثہ ہیں اور انہیں اسی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے۔

قومی اسلام کا یہ تصور جس کی جڑیں ہمارے متقدمین کی فہم و بصیرت میں ہیں، خالص اسلام کی طرف ہماری مراجعت میں مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ اسلام کے اس قومی تصور نے فی زمانہ پوری دنیا میں مسلم نوجوانوں اور ان کی احمیائی تحریکوں کو ایک غولِ بیابانی میں تبدیل کر رکھا ہے۔ قدیم مشرقی ثقافتی علامتوں کو وہ اسلام سمجھ بیٹھے ہیں، جس سے ذرہ برابر بھی انحراف کفر و اسلام کی جنگ بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کے جغرافیائی تنازعے اور وطنی آزادی کی تحریکیں جہاد فی سبیل اللہ قرار پاتی ہیں۔ ثقافت اور اسلام کے اس مسلسل دھوپ چھاؤں کے کھیل نے خود مسلم ذہنوں پر اسلام کی مابیت اور اس کے مستقبل کے سلسلے میں سخت ابہام اور مغالطوں کو جنم دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان گذشتہ چند صدیوں سے من حیث القوم مسلسل پسپائی کے شکار ہیں اور گذشتہ چند برسوں سے پسپائی کا یہ عذاب اپنی انتہاء پر ہے۔ افغانستان، عراق، فلسطین، بوسینا، کشمیر، گجرات، فلپین اور چچینا جہاں بھی خون بہہ رہا ہے وہ ان ہی قومی مسلمانوں کا خون ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور مغرب کے دوسرے شہروں میں دہشت گردی کے نام پر مسلم نوجوان ہی نشانے پر ہیں۔ گوانٹانامو بے کی عقوبت گاہ یا ابو غریب کی جیل میں جو کچھ ہوا اس کا شکار بھی مسلم قوم ہی بنی۔ لیکن ان سب کے باوجود اگر مسلمان بھی مدافعت کی جنگ میں ان اعلیٰ انسانی اقدار کو نظر انداز کر گئے تو پھر دوسری قوموں پر ان کا وجہ امتیاز کیا رہ جائے گا؟ گجرات میں ہم جلائے گئے، بوسنیا میں ہماری عزتیں تاراج ہوئیں۔ فلسطین میں ہم ایک منظم ریاستی دہشت گردی کا شکار ہیں لیکن اس کے جواب میں ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ عین یہی سب کچھ نہیں کر سکتے۔ قومی مسلمانوں کیلئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی قوم کے مقابلے میں دشمن قوم کو زک پہنچانے کیلئے کوئی بھی اقدام کر ڈالیں۔ البتہ وحی کا آفاقی نقطہ نظر ہمیں مسلسل اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہم بعض شیطان صفتوں کی وجہ سے اس پوری قوم کو من حیث القوم قابلِ گردن زدنی قرار نہیں دے سکتے۔ ہم جو انسانوں کی نصیح و خیر خواہی اور ان کی فلاح و نجات کے لئے پیدا کئے گئے ہیں ہم انہیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسا کہ وہ ہیں نہ یہ کہ ان کا تعلق کس

قوم سے ہے۔ بڑے بڑوں کے دل و دماغ پر مسلم قومی افتخار اور مسلم قومی مفاد کے جذبات اتنے شدید ہیں کہ وہ کسی بھی مسئلہ پر خالص حامل قرآن کی حیثیت سے سوچنے کا یارا نہیں رکھتے۔ مسئلہ فلسطین کا لانیل ہونا خدائے واحد کی علمبردار دو قوموں کا اتنے طویل عرصے تک آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہونا اور پھر اس صورت حال پر مسلمانوں اور اہل یہود کے علماء و متفقین کا مسلسل خاموش رہنا اسی بات کا تو ثبوت ہے کہ اہل یہود کے علماء کی طرح مسلم اہل فکر بھی قومی افتخار کے اس حد تک اسیر ہو گئے ہیں کہ وہ کوئی غیر روایتی حل پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ دنیا فساد سے بھرتی جارہی ہے۔ قوموں کے تصادم کے اس ماحول میں جہاں خود حاملین قرآن بھی بد قسمتی سے اس قومی تصادم میں فریق بن گئے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس آفاقی اسلام کو وحی کے دفتین سے از سر نو برآمد کیا جائے جس کے پس پشت چلے جانے کی وجہ سے ہم تاریخ کے انحراف میں جینے پر مجبور ہیں۔



دینی تحریکیں ابھی تک عہد عباسی کے فقہی تصورات کو ہی دین کا حاصل سمجھتی ہیں، وہ اس دانشورانہ چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ قرآنی نظامِ رحمت کی تعبیر مزاحمت اور مدافعت کی زبان سے پرے بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن جہاں وسعتِ قلب و نظر کا داعی ہے وہیں فقہی اور مسلکی طرزِ فکر خود مسلم معاشرے کو ایک خانہ جنگی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خود کو مستند مسلمان بتانے اور دوسروں کو دائرہ اسلام کی سرحد پر بھی جگہ نہ دینے کے رویے نے مختلف مسلم معاشرے کو ایک طرح کی خانہ جنگی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

کیا ایک نئی پیمرانہ بصیرت ممکن ہے؟

کہ ناپینا اور چشم پینا رکھنے والا برابر نہیں

اور نہ ہی تاریکی اور روشنی

اور نہ ہی سایہ اور دھوپ

(فاطر: ۲۱ تا ۱۹)

عہد جدید کے عذابوں میں ایک بڑا عذاب نظر کے فریب کا ہے، میڈیا کی پیدا کردہ اس دنیا میں ہم ایک سرابِ مسلسل سے دوچار ہیں، منظر نامہ اتنا کریہہ ہے کہ اگر وہ اپنی اصل صورت میں نظر آجائے تو ہم میں سے بہتوں کے ہوش و حواس خبط ہو جائیں، انسان جینے کا حوصلہ کھو دے، دل و دماغ مفلوج ہو جائے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نگاہوں کے سحر اور بصیرت کے فقدان نے ہمیں صورت حال کی سنگینی کے ادراک سے روکے رکھا ہے، یہ کچھ وہی صورت حال ہے جب اہل زمین کی ہدایت کے لئے خدا اپنے پیغمبروں کو بھیجتا ہے، اللہم ارنی الاشیاء کما ہی۔

انبیاء کا بنیادی کام قلب و نظر کی تبدیلی ہوتا ہے، ان کی دعوت الی اللہ ایک نیا world view وجود میں لاتی ہے۔ قرآن کی زبان میں ظلمات سے نور کا یہ سفر اندھوں کو چشم پینا عطا کرتا ہے، اشیاء اپنی اصل ماہیت میں نظر آنے لگتی ہیں، توہمات کے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مردہ اور بے جان میں از سر نو زندگی کی روح پھونک دی گئی ہو، حضرت مسیحؑ کے حوالے سے قرآن مجید میں زندگی کا نیا تصور پھونکنے اور شفاءِ قلبی عطا کئے جانے کا واقعہ گو کہ خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے البتہ شفاءِ لما

فی الصدور (یونس: ۵۷) کا یہ آسمانی نسخہ آج بھی قرآن مجید کی شکل میں اس سرزمین پر موجود ہے۔ محمد رسول اللہ نے کوئی پندرہ صدیوں پہلے جب خوابیدہ انسانیت کو ایک فکری، عقلی، اور روحانی دھماکے سے آشنا کیا اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسانی دل و دماغ میں تمام پوشیدہ صلاحیتیں اپنی انتہائی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگی ہیں۔ قلب و نظر کی دنیا میں اس زبردست ربانی دھماکے کی گونج مدتوں سنی جاتی رہی، حتیٰ کہ آج بھی جب اس واقعہ پر پوری پندرہ صدیاں بیت چکی ہیں ارتعاش کی ان لہروں کا سلسلہ تھما نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب گونا گوں لہروں میں اس کا وہ تفوق باقی نہیں رہا۔ صورت حال یہاں تک آ پہنچی کہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں کی ایک قابل ذکر آبادی بھی آج اس خیال کو دل سے لگائے بیٹھی ہے کہ کوئی مہدی منتظر یا مسیح موعود اسے موجودہ صورت حال سے نجات دلانے کے لئے گویا بس اب آنے ہی کو ہے، بالفاظ دیگر دوسری اقوام کی طرح مسلمان بھی ایک نئے ذیلی نبی کے منتظر ہیں یا کم از کم ان کی نگاہیں ایک ایسی روشنی کے نزول کے لئے آسمان تک اٹھ رہی ہیں جو نئی زمانہ غیاب محمدی کی کفایت کر سکے۔

مسلمانوں کی مسلسل ہزیمت کے پیش نظر کسی ایسے داعیہ کی نفسیاتی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے کہ Crusoe-like-approach کا قبولیت اختیار کر لینا ہزیمت خوردہ قوموں کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نئے مسیحا کے انتظار میں دوسری اقوام بھی پیچھے نہیں۔ عیسائیت گو کہ آج بھی غالب اقوام کا دین ہے لیکن خود عیسائیت کے اپنے گڑھ میں صدیوں سے اسے مسلسل جس فکری اور نظری پسپائی کا سامنا ہے اور جس طرح اسے اجتماعی زندگی سے فرار پر مجبور ہونا پڑا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقوام مغرب کے قدموں کے نیچے اب وہ پتھر نہیں رہا جس کے باعث انکی سماجی زندگی قائم تھی یا جس پر وہ روحانی ضرورت کے لئے ٹیک لگاتے تھے۔ کیتھولک عقیدے کے زوال سے لے کر Liberal Capitalism کے سفر میں اہل مغرب خود کو جس دنیا میں پاتے ہیں وہ حریت فکری، روشن خیالی اور اکرام آدمیت کی دنیا نہیں بلکہ Fascist Liberalism کا کریہہ منظر نامہ ہے جس کے بعد مغربی مفکرین نے سفر تاریخ کے خاتمے کا بگل بجا دیا ہے۔ کمیونزم کے زوال اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جن لوگوں کو یہ توقع تھی کہ امریکی معاشرے میں فکر و نظر کی وسعت اور انسانی آزادی کا جو تجربہ ہوا ہے اس کا دائرہ پوری دنیا تک پھیل جائے گا انہیں Capitalism کے انسانی mask کے پیچھے چھپے مکروہ چہرے سے سخت مایوسی ہوئی ہے۔ انہیں اس خیال نے بھی لرزہ بر اندام کر دیا ہے کہ جنت نشاں امریکہ کی تابناک خوشحالی کے پیچھے مقہور و مجبور اقوام

اور پسماندہ ممالک کا مسلسل نہ تھمنے والا استحصال ہے جس کے بغیر جنت نشاں امریکہ کی آب و تاب باقی نہیں رہ سکتی۔ ذرا غور کیجئے ہندوستان کے مقابلے میں امریکہ میں ایک تہائی آبادی رہتی ہے لیکن وہ پوری دنیا کے ایک تہائی سے بھی زیادہ وسائل اکیلے ہڑپ کر جاتا ہے۔ اگر اہل ہندوستان بھی اسی پر آسائش زندگی پر مصر ہو جائیں تو ایسی صورت حال میں ہندوستان کے علاوہ کرہ ارض کی تمام آبادی فاقوں کی تاب نہ لا کر دم توڑ دے گی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جنت ارضی امریکہ اور یورپ کے دوسرے پر تعیش معاشرے کو راست ایسے اقدامات کرنے پڑے ہیں جس سے ان کا لوٹ کھسوٹ ہر خاص و عام پر واضح ہو گیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کا بیدار مغز اور بیدار دل انسان بھی اس صورت حال پر اپنے اندر اضطراب محسوس کرتا ہے اور ان کی ایک قابل ذکر آبادی انسانوں کے استحصال اور ان کے اتلاف جان کی قیمت پر اپنی جنت ارضی کی چمک دک کو برقرار رکھنا جائز نہیں سمجھتی، انہیں صاف محسوس ہوتا ہے کہ جن خوشمناعروں کے بل بوتے پر وہ اپنے معاشرے پر فخر کرتے تھے انکی بنیادیں ہل گئی ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ اندر سے احساس جرم میں مبتلا ہیں بلکہ اس مصیبت پر پریشان بھی کہ وہ خود کو Fascist Liberalism کے نرغے میں پاتے ہیں، ایک ایسا فاشزم جس نے تازہ بہ تازہ ایک ایسے نامانوس مذہب کو جنم دیا ہے جسے Evangelical Capitalism کہا جاسکتا ہے اور جس کے نعرے God bless America نے خدا کو بھی امریکا کی خدمت پر مامور کر دیا ہے۔

مغرب میں دنیا کو خود کشی سے دوچار کرنے کی تحریک روز افزوں اضافے پر ہے، ایسا اس لئے بھی کہ فاشٹ کپٹل ازم کو لگام دینے کے لئے اب بظاہر کوئی مؤثر قوت باقی نہیں رہ گئی ہے، کمیونزم کے زوال کے بعد مشرق میں روحانیت کے جو چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آ رہے تھے اور جہاں فی زمانہ دنیا کے موجودہ صورت حال پر سخت اضطراب پایا جاتا ہے اسے قوت کے بل پر قابو میں لانے کی سر توڑ جدوجہد جاری ہے۔ Globalization کے اسرار و عواقب نے واقعہ یہ ہے کہ پوری دنیا کو Capitalist Fascism کے بپتوں میں جکڑے جانے کی سہولتیں فراہم کر دی ہیں، گویا فاسٹ اٹلی اور نازی جرمنی میں انسانوں کو اپنی بے بسی کا جو احساس مقامی سطح پر ہوا تھا کچھ یہی صورت حال اس وقت عالمی سطح پر کئی گنا شدت کے ساتھ پوری دنیائے انسانیت پر طاری ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ فاشٹ Capitalism کے علمبردار اس صورت حال کو انسانی تاریخ کی معراج بتاتے ہیں، ان کے نزدیک تاریخ اپنے منطقی ارتقائی سفر کے بعد لبرل ڈیموکریسی کی منزل پر آ پہنچی ہے اور یہی تاریخ کی آخری منزل ہے۔

لیکن یہ تو صرف تصویر کا ایک رخ ہے، اہل فکر مسلمانوں کو اس مسئلہ پر سوچنے کی ضرورت ہے کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا کہ آخری امت کے ہاتھوں سے تاریخ کی لگام پھسلتی چلی گئی اور جنہیں اہل زمین کی نجات دہی کے لئے معمور کیا گیا تھا وہ خود اپنی موت و حیات کی عبرت ناک کشمکش میں گرفتار ہو گئے۔ اس بنیادی سوال کا جواب فراہم کئے بغیر مغرب کے مسلسل بڑھتے سیلاب پر روک لگانا ممکن نہیں۔

ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں اسلام کا فکری سرمایہ مدافعت کی زبان میں کیوں لکھا گیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نظری طور پر دنیا کی قیادت کے لئے اٹھائے گئے تھے اور جنہیں آخری نبی کے متبعین کی حیثیت سے رحمت للعالمین کا فریضہ انجام دینا تھا وہ خود کو اقوام عالم کے مقابلے میں ایک فریق کی حیثیت سے اس قدر دیکھنے کے عادی ہوئے کہ ان کی نفسیات پر مدافعت پوری طرح غالب آگئی، تحریک دعوت یا تحریک رحمت کے حاملین تحریک مزاحمت کے ذہنی سانچے سے جب تک نہیں نکلتے ان کے لئے قرآن کے آفاقی پیغام سے فائدہ اٹھانا اور اسے بروئے کار لانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

ہم اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتے کہ تمسک بالکتاب والسنۃ کے حاملین مغرب کی پیدا کردہ اس دنیا میں خود کو حاشیے پر محسوس کرتے ہیں، قال اللہ وقال الرسول کی درسگاہیں خواہ اپنے بارے میں کتنے ہی اعلیٰ خیالات رکھتی ہوں واقعہ یہ ہے کہ جدید technological دنیا میں ان کا وجود بے محل ہو کر رہ گیا ہے۔ اب دنیا کا ان پر انحصار نہیں بلکہ وہ دنیا پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ علوم کے سلسلے میں ہمارے تراشیدہ التباسات نے ہمیں تاریخ کے dustbin میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے، اب جو لوگ اس صورت حال پر ماتم کناں ہیں اور شدت جذبات میں سب کچھ کر گزرنے کے لئے خود کو آمادہ پاتے ہیں انہیں اس سنگین صورت حال سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں دکھتا۔ قدیم علماء کی تعبیرات اور فقہاء کی تحریریں چونکہ مدافعت اور مزاحمت کے فکری سانچے میں تیار کی گئی ہیں اس لئے وہ شوق شہادت تو پیدا کر سکتی ہیں البتہ ان سے کوئی راستہ نہیں مل سکتا، رہے وہ لوگ جو قدامت پر انحصار کے بجائے ایک نئے راستے کے متلاشی ہیں تو ان کی بڑی اکثریت قرآنی دائرہ فکر میں واپس جانے کے بجائے اپنے دل و دماغ پر انحصار کو کافی سمجھتی ہے، ایسا اس لئے بھی کہ ان کا دل و دماغ language of resistance میں لکھی گئی تحریروں کو قبول نہیں کرتا اور وہ خود language of mercy میں فہم قرآن کے منہج سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پھر گذشتہ صدیوں میں مسلم معاشرے میں دین کے نام پر جو سیاسی تحریکیں اٹھیں ہیں اور جس کی وجہ سے دین کو ایک سیاسی

نعرے کے طور پر استعمال کرنے کا رواج ہوا ہے اس نے بھی اہل فکر مسلمانوں کو قرآنی طریقہ فکر اختیار کرنے سے روک رکھا ہے۔ سیاسی تحریکوں نے شریعت کے حوالے سے فقہی زندگی کے احیاء کو کافی جانا اور وہ شریعت کو فقہ کا متبادل سمجھنے کی غلطی میں مبتلا رہے۔ نائجیریا یا پاکستان میں شریعت کے نام پر عملاً بعض مسالک کے فقہی نظام کے احیاء کی کوشش کی گئی اور اس عمل میں کسی نے اتنی بھی کوشش نہ کی کہ قرآن سے راست اکتساب کے ذریعے ان فقہی تعبیرات کا کم از کم ایک بار محاکمہ کر لیا جاتا، جو لوگ شریعت کے نام پر حکمرانی کا حق مانگ رہے تھے انہوں نے اس کا موقع ہی کب دیا کہ شریعت ان کے نظام حکمرانی کا محاکمہ کرے وہ تو بس اتنا ہی کافی سمجھتے تھے کہ شریعت ان کی حکمرانی میں محض خدمت کا فریضہ انجام دے۔ پاکستان، افغانستان، نائجیریا جیسی جگہوں پر شریعت کے نام پر ہونے والے تجربوں نے خود اسلامی نظام کے سلسلے میں مایوسی کی ایک فضاء کو جنم دیا ہے۔

دوسری طرف بیسویں صدی کے نصف اول میں اٹھنے والی پرشور دینی تحریکیں بھی جس اسلامی نظام کے نعرے کے ساتھ سامنے آئی تھیں ایسا محسوس ہوتا ہے اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکی ہیں۔ مصر اور پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے حوالے سے ابھی تک کسی نظام رحمت کے بجائے مسلکی تشدد اور تنگ نظری کا منظر نامہ ہی آتا ہے، طالبان کے تجربے اور متحدہ مجلس عمل میں جماعت اسلامی کے کلیدی رول نے اس خیال کو مزید تقویت دی ہے کہ دینی تحریکیں ابھی تک عہد عباسی کے فقہی تصورات کو ہی دین کا حاصل سمجھتی ہیں، وہ اس دانشورانہ چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ قرآنی نظام رحمت کی تعبیر مزاحمت اور مدافعت کی زبان سے پرے بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن جہاں وسعت قلب و نظر کا داعی ہے وہیں فقہی اور مسلکی طرز فکر خود مسلم معاشرے کو ایک خانہ جنگی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خود کو مستند مسلمان بتانے اور دوسروں کو دائرہ اسلام کی سرحد پر بھی جگہ نہ دینے کے رویے نے مختلف مسلم معاشرے کو ایک طرح کی خانہ جنگی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پاکستان، تیونس، الجزائر، مصر جہاں بھی فقہی طریقہ تعبیر کے ذریعے مزاحمت کی زبان میں اسلام کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مسلم معاشرہ ایک طرح کی خانہ جنگی سے دوچار ہے۔ کچھ یہی حال عصر حاضر کی نئی سلفی تحریک کا ہے جس نے ماضی میں اوہام پرستی اور آباء پرستی کو لگام دینے میں بڑا رول انجام دیا ہے لیکن اب یہاں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبد الوہاب کو احبار کے درجے پر فائز کر دینے سے سلف صالح کے حوالے سے ﴿وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ کی فضا عام ہے۔

گویا دنیا اگر ایک طرف Capitalist Fascism کے نرغے میں ہے تو دوسری طرف دنیا کے

آخری نجات دہندوں پر اپنے مقصد سے بے شعوری اور کارِ نبوت سے بے خبری کی فضا عام ہے۔ انسانی تاریخ آج جہاں اندھی گلی میں پھنسی محسوس ہوتی ہے اور جسے مغربی مفکرین تاریخ کی آخری منزل قرار دیتے ہیں وہ دراصل انسانی تاریخ کا انحراف ہے جس کی بنیادی وجہ تبیین محمد ﷺ کی اپنے منصب امامت سے خود اختیار کردہ معزولی ہے۔ قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود غیر قرآنی ماخذ پر امت کا غیر معمولی انحصار اور کتاب ہدایت کے بجائے کتب فقہ پر مشتمل آراء الرجال کو مشعل حیات قرار دینے کے سبب، واقعہ یہ ہے کہ آج پوری امت دینِ آباء کی اسیر ہو کر رہ گئی ہے۔ وحی کے گرد تشریحات و تاویلات، قصص و تاریخ، روایات و کشف کے پہرے اتنے سخت ہیں کہ اب کتاب ہدایت سے راست اکتساب کا چیلنج قبول کرنے کے لئے وہ لوگ بھی آمادہ دکھائی نہیں دیتے جنہوں نے اپنی عمر عزیز کو علوم دین کے حوالے سے وقف کر رکھا ہے اور جن سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ امت کو اور اس سے آگے بڑھ کر پوری دنیائے انسانیت کو اس اندھی گلی سے نکالنے میں قائدانہ رول ادا کریں گے۔ مطالعہ قرآنی کے سلسلے میں ہم عرصے سے جس منہج کے اسیر ہیں، جسے سید قطب کی اصطلاح میں المنطق الوجدانی کہا جانا چاہئے، اس نے تفکر و تدبر سے کہیں زیادہ عقلی رویے کی بیخ کنی کی ہے۔ سلف اور قدامت کی فہم پر غیر معمولی انحصار بلکہ انہیں دلیل اور حکم قرار دے لینے کے نتیجے میں ہم قرآن کے سلسلے میں صدیوں سے ایک ایسی صورت حال میں مبتلا ہیں جسے Kant کی اصطلاح میں 'self imposed immaturity' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وحی کے سلسلے میں ہمارا تجربہ ایک ایسی روشنی کا ہے جس نے کوئی چودہ صدیوں پہلے اہل ایمان کے ایک گروہ کو غیر معمولی تقلیب فکر و نظر سے دوچار کر دیا تھا، فکر و نظر کا یہ انقلاب ہمارے لئے ماضی کی ایک مقدس داستان ہے، ہم فی نفسہ اس تجربے سے نا آشنا ہیں۔ گویا قرآن کی حیثیت اور اس کا عملی رول ہمارے درمیان روشنی کی ایک داستانِ سابقہ کی ہے، روشنی کی نہیں۔ اور یہ وہ صورت حال ہے جس نے صدیوں سے پوری امت کو روشنی سے ظلمت کی طرف ایک سفر معکوس میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو اگر کچھلی قومیں وحی سے بے اعتنائی برتنے کے نتیجے میں گمراہی میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان قرآن مجید سے مجرمانہ غفلت برتنے کے باوجود روشنی سے اندھیرے کی طرف انخلاء پر مجبور نہ کئے جائیں۔

ظلمت کا عذاب جب شدید ہو جائے تو ڈر اور خوف اس کا لازمہ بن جاتا ہے۔ وحی کی روشنی جب ساتھ چھوڑ دے تو آنکھیں منزل کی نشاندہی کیسے کر سکتی ہیں: ﴿ذهب الله بنورهم و تركهم في ظلمات لا يبصرون﴾ (البقرة: ۱۷) ڈر، خوف جس سے انسانی وجود لرز جاتا ہو ان قوموں کا خاص شعار ہے جو

بوجہ وحی الہی سے تہی دامن رہ گئے ہوں: ﴿وَكَصَّبَ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ﴾ (البقرة: ۱۹) ظلمت کا یہ عذاب انہیں ایک ایسی صورت حال سے دوچار رکھتا جسے قرآن نے ﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يُخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ﴾ کہا ہے یعنی ایک ایسی صورت حال جب روشنی بصیرت دینے کے بجائے بصیرت سلب کر لیتی ہو، اس روشنی میں وہ چند لمحے چلتے پھرتے اور پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس قرآنی بیان کی روشنی میں دیکھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند الفاظ میں موجودہ امت مسلمہ کی تصویر کشی کر دی گئی ہو۔

صورت حال کی سنگینی اس بات کی طالب ہے کہ امت مسلمہ کے سفر معکوس پر فی الفور روک لگائی جائے۔ ماضی میں اس کا عظیم کوانجام دینے کے لئے انبیاء کو مبعوث کیا جاتا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ اس کام کی عظمت اور اس چیلنج کی شدت کم از کم ایک نبی کا مطالبہ تو ضرور کرتی ہے۔ جو لوگ آخری نبی کے آجانے کے بعد بھی کسی مسیحا، مہدی، امام غائب یا مسیح موعود کے منتظر ہیں ان کے ذہنوں پر اس کا عظیم کا یہی چیلنج ہے، البتہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ کی شکل میں انسانی تاریخ کے آخری نبی کا ظہور ہو چکا ہے اور جو آپ ﷺ پر نازل ہونے والے غیر محرف صحیفہ کی اصل عظمت سے آشنا ہیں ان کے لئے اس خیال کو تسلیم کرنے میں ذرہ برابر بھی تکلف نہیں ہونا چاہئے کہ غیاب محمدی میں تاریخ کے انحراف کی درستی نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ مطلوب بھی۔ قرآن مجید جب تک اپنی اصل آب و تاب اور غیر محرف شکل میں باقی رہے گا، غیاب محمدی یا غیاب نبی میں ہر لمحہ ایک نئی روشنی کے طلوع کا امکان عین ممکن قرار پائے گا۔ گویا دنیا کو ایک نئے Enlightenment سے آشنا کرنے کا امکان تاریخ کے ہر لمحے میں حاملین قرآن کی دسترس میں ہوگا۔

نئے دور کی ظلمت جس میں آج پوری دنیائے انسانیت مبتلا ہے اور جس سے متبعین محمد کو بھی وافر حصہ ملا ہے اوہام پرستی یا اصنام پرستی نہیں بلکہ ایک طرح کی بے حسی، بے خبری بلکہ casual انداز فکر ہے جو دراصل چیزوں کی اصل ماہیت کے غیاب سے پیدا ہوئی ہے۔ ماضی کے مقابلے میں یہ نئی صورت حال کہیں سنگین ہے، دعائے محمدی اللہم أرني الأشياء كما هي کی اتنی شدید حاجت شاید تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ چیزوں کی اصل ماہیت کے ادراک کے بغیر نہ تو صحیح محاکمہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے لئے کوئی راستہ مل سکتا ہے، اور یہ کام غیاب محمدی میں قرآن مجید کے ذریعے ہی انجام پائے گا کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو کامل ہدایت کا اعلامیہ ہے۔ ﴿مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾

(الأنعام: ۳۸) یہ سراسر روشنی اور کتابِ مبین ہے (مانندہ: ۱۵) دنیا کو ایک نئے Enlightenment سے آشنا کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ پوری امت آباء پرستی اور اسلاف پرستی سے دست کش ہو کر خدا اور اس کی کتاب کا دامن تھام لے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اہل ایمان کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے (بقرہ: ۲۵۷) اور بے شک یہ اسی کی ذات ہے جس نے اپنے بندے پر واضح آیات اتاری تاکہ ظلمت میں پھنسا انسانی قافلہ روشنی کی طرف سفر کر سکے ﴿هو الذي ينزل على عبده آيات بينت ليخرجكم من الظلمات الى النور﴾ (الحديد: ۹) اگر آج بھی حاملین قرآن وحی ربانی کا راست چیلنج قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو وہ اندھیروں سے روشنی کے اس سفر میں اپنی پشت پر تائید ایزدی کو پائیں گے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿هو الذي يصلي عليكم و ملئكته ليخرجكم من الظلمات الى النور و كان بالمؤمنين رحيماً﴾ (الاحزاب: ۴۳)۔ اندھیرا کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو حاملین قرآن کے لئے تاریخ کے ہر لمحے میں ایک نئی صبح کی بشارت دینا عین ممکن ہے حتیٰ کہ آج بھی جب ہم ایک اندھی گلی میں پھنس گئے ہیں جب ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اپنی لغزشوں کی پاداش میں ہم مثل حضرت یونس خود کو مچھلی کے تنگ و تاریک پیٹ میں بے بس محسوس کرتے ہوں اور اس صورت حال سے نجات کے تمام امکانات دروازے بند ہو گئے ہوں تب بھی ایک نئے Enlightenment، ایک نئی ابتداء ہمارے دروں پر دستک دے رہی ہے شرط یہ ہے کہ ہم بھی مثل یونس اپنی غلطیوں کے اعتراف کا حوصلہ رکھتے ہوں: ﴿فنادى فى الظلمات ان لا اله الا انت سبحانك انى كنت من الظالمين﴾ (الانبیاء: ۸۷)۔



خدا کے علاوہ انسانوں کے کسی گروہ کو اس بات کا اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اجماع کا دھونس دے کر یا اہل حل و عقد کے حوالے سے ہمیں کسی مسئلہ پر تحلیل و تجزیے سے باز رکھے۔ یہ رویہ قرآن کے rational discourse کے خلاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خود توحید کے بنیادی اعتقادات کو ہمیں عقلی استدلال کے ذریعہ باور کرانا چاہتا ہے اور جب قرآن اپنے ماننے والوں سے اس بات کا طالب ہے کہ وہ تحقیق و تجزیہ کے ذریعہ اشیا کی ماہیت تک پہنچنے کی کوشش کریں تو پھر عام انسانوں کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ اکثریت کے حوالے سے یا وجدنا آباءنا كذلك يفعلون کے سہارے ہمیں کسی مسئلہ کو طے شدہ یا closed for discussion باور کرائیں۔



عرصے سے حکمائے اسلام نے عقل اور وحی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ رکھا ہے۔ مسلم متکلمین مشاہدے کے مقابلے میں وجدانی علوم کے تفوق کے قائل رہے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں مشاہداتی علوم کے سلسلے میں ایک طرح کی بے توقیری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید، جو مسلمانوں میں وجدانی علوم کا بنیادی ماخذ ہے، تدبر و تفکر اور مشاہدے کی بھرپور وکالت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وجدان کی عمارت عقل کی بنیادوں پر رکھی جائے۔ بھلا جو وجدان عقل کو قائل نہ کر سکے یا جو دانش انسانی کی پہنچ سے باہر ہو اسے انسانوں کے لئے مشعل راہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

امت مسلمہ کی تشکیل نو

اسلام پوری انسانیت کے لئے خدا کا پسندیدہ دین ہے اور محمد رسول اللہ کافۃ للناس بشیرا و نذیرا اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ اسلام کی یہ دعوت جسے آخری نبی اور ان کے سچے متبعین کے ہاتھوں تاریخ کے آخری لمحے تک انسانیت کی رہنمائی کرنی ہے کسی قومی یا ملی شناخت کا نام نہیں بلکہ غیر مشروط سپردگی کے اس والہانہ رویے کا نام ہے جس کا اظہار انسانی تاریخ میں تسلسل اور ترتیب کے ساتھ انبیائے کرام کے ذریعے ہوتا رہا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں تاریخ کے مختلف ادوار میں، تمام ہی انبیاء انسانوں کو غیر مشروط عبودیت کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ اب جب سلسلہ رسالت اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے، سپردگی کی اس تحریک کو اپنے انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری محمد رسول اللہ کے متبعین پر عائد کی گئی ہے۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ انبیائے سابقین کی دوسری امتیں یا متقین کے دوسرے گروہ ہمیشہ کیلئے اس عظیم نبوی تحریک سے باہر کر دیئے گئے ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے جہاں متبعین محمد کو کلیدی اور مرکزی کردار ادا کرنا ہے وہیں دوسری اقوام کے متبعین کو بھی اس انبیائی تحریک میں اپنی بساط بھر شریک ہونا ہے کہ انسانیت کی فلاح کا کوئی وسیع پروجیکٹ وسعت نظری اور وسعت قلبی کے بغیر انجام نہیں پاسکتا۔ اگر اسلام کی دعوت سے مراد کسی خاص لسانی، قومی، جغرافیائی یا ملی گروہ کا غلبہ نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت کی سعید روحیں خواہ وہ دنیا کی کسی قوم یا ملت میں پائی جاتی ہوں اس تحریک میں اپنے اندر والہانہ شرکت کا داعیہ محسوس نہ کریں۔

قرآن کا ایک معمولی طالب علم بھی اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ ابراہیمؑ سے لے کر محمدؐ تک اس دنیا میں انبیاء کے ذریعے انسانوں کو جس بات کی طرف بلایا جاتا رہا ہے وہ خدا کے آگے غیر مشروط

سپردگی کی یہی دعوت ہے جسے ہم اسلام سے موسوم کرتے ہیں۔ ابراہیم، اٹحق و اسمعیل بنی اسرائیل کے تمام انبیاء اور دیگر اقوام کی طرف بھیجے جانے والے نبی حتیٰ کہ وہ بھی جن کا تذکرہ قرآن میں موجود نہیں ہے، ایک ہی دین کے امین اور مبلغ رہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کے حوالے سے مسلم ذہنوں میں کسی قسم کے گروہی تعصب کا داعیہ پیدا ہو۔ قرآن مجید کی یہ تنبیہ کہ اہل ایمان انبیاء کے سلسلے میں ﴿لَا نَفَرُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ﴾ (البقرة: ۲۸۵) کے رویے پر عامل ہوتے ہیں، دراصل اسی بات کو ذہن نشین کرانا ہے کہ خانوادہ نبوت کے تمام ہی عالی مقام حاملین ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک کی شخصیت یا دعوت دوسرے سے متضاد یا متعارض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ کے متبعین کے لئے اس بات کو لازم کیا گیا کہ وہ نہ صرف اس کتاب پر ایمان لائیں جو محمدؐ کی طرف بھیجی گئی ہے بلکہ ان تمام سابقہ کتب اور انبیاء کو بھی اسی نبوی تحریک کا حصہ سمجھیں جن کے باقیات دنیا کے مختلف خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ گویا آخری رسولؐ کی بعثت سے کسی نئے دین کی داغ بیل نہیں ڈالی جا رہی ہے اور نہ ہی قرآنی وحی کسی نئی ابتداء کا سامان ہے بلکہ یہ پچھلوں کی تصدیق کرنے اور باقیات امم سابقہ کے ورثے کو سمیٹتے ہوئے، بنیادی باتوں پر ان کو اشتراک عمل کے ذریعے ایک ایسے عالمی انقلاب کی بنیاد رکھنے جا رہی ہے، جس میں تمام ہی انبیائے سابقین کی دعوتوں کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔

محمد رسول اللہ نے کسی نئی امت کی بنیاد نہیں رکھی اور نہ ہی اپنے متبعین کو کسی نئے گروہ سے موسوم کیا۔ قرآن کا انداز دعوت اس نکتہ کی مسلسل وضاحت سے عبارت ہے کہ محمد رسول اللہ کسی نئی امت کے قیام کے بجائے اطاعت گزاروں کے اسی خانوادے کے احیاء کیلئے تشریف لائے ہیں جن کی باقیات مختلف شکلوں میں اس سرزمین پر موجود ہے اور جن کا نظری و فکری ماحصل اب صرف یہی رہ گیا ہے کہ وہ انبیائے سابقین سے اپنا نسلی یا مذہبی رشتہ بتاتے رہیں اور اسے اپنی نجات کے لئے کافی سمجھیں۔

﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى﴾ کے جواب میں یہ کہا جانا کہ ﴿قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ (البقرة: ۱۳۵) دراصل اسی وسعت فکری کا اظہار تھا کہ آخری نبی کسی نئی امت کے قیام کا داعی نہیں بلکہ امت ابراہیمی کا احیاء کرنے والا ہے اور اسکی دعوت تمام انبیائے سابقہ کی دعوتوں کا ارتکاز ہے: ﴿قُلْ اِنْسِي هِدَانِي رَبِّي اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ (الأنعام: ۱۶۱)۔ قرآن مختلف اسالیب میں بار بار اس حقیقت کو ذہن نشین کراتا ہے کہ متبعین محمدؐ کو جو کچھ عطا ہوا ہے یہ وہی دین ہے جو اس سے قبل انبیائے سابقین لاتے رہے ہیں: ﴿مَنْ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وُصِيَ بِهِ نوحاً وَاَلِىٰ وَاحِشًا وَابْرٰهِيْمَ﴾

(الشوری: ۱۳) - دین ابراہیمی کے سابق دعویدار انبیائے سابقین کے متبعین سے باسالیب مختلف یہ بات کہی جاتی رہی کہ فی زمانہ دین ابراہیمی کا امین محمدؐ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے: ﴿ان اُولٰٓئِی النَّاسِ بِاِبْرٰهٖمَ لِلذِّیْنِ اٰتٰیوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالذِّیْنِ اٰمَنُوْا﴾ (آل عمران: ۶۸) - رہے وہ لوگ جو محمدؐ پر ایمان لے آئے ہیں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ نئے نبی کی قیادت میں اسی دین پر کار بند ہیں جس کے بابت انہیں اس سے پہلے توراة و انجیل میں انہیں بتایا جا چکا ہے۔ ﴿الذِّیْنِ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاَمٰی الَّذِیْنَ یُحٰدُوْنَہٗ مَکْتُوبًا عِنْدَہُمْ فِی التَّوْرَةِ وَالْاِنْجِیْلِ﴾ (الاعراف: ۱۵۷) محمد رسول اللہ انبیائے سابقین کی جس وراثت کے امین ہیں اور جس مشن کو خوشگوار انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری آپ پر عائد کی گئی اس سے فطری طور پر یہ بات مترشح ہوتی تھی کہ آخری نبی کسی خاص نسل، گروہ یا جغرافیائی سرحدوں میں رہنے والے انسانوں کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے پیش نظر عام انسانیت کی فلاح ہے۔ کسی ایسے بین الاقوامی نبی سے، جس پر آنے والی پوری تاریخ کا انحصار ہو، یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی کوئی الگ امت بنائے گا اور صرف اس کی فلاح و نجات کو اپنا ہدف قرار دے لے گا۔ دین ابراہیمی کے سچے وارث کی حیثیت سے محمد رسول اللہ بھلا ایسا کیسے کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم تاریخ کے ابتدائی ایام میں کسی گوشہ سے امت محمدیہ کی اصطلاح سننے میں نہیں ملتی۔ محمدؐ ہی پر کیا موقوف دنیا کے کسی نبی نے بھی اپنی ذات کی بنیاد پر کسی امت کی تشکیل کی کوشش نہیں کی۔ یہودی، نصرانی، بدھشت جیسی شناختیں بہت بعد کی پیداوار ہیں جو اپنے داعیوں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے متبعین نے ایجاد کر ڈالیں۔ نبی کا یہ مقام نہیں کہ وہ وحدت آدمیت کو ٹکڑوں میں بانٹے یا خدا کی طرف بلانے کے بجائے اپنی شخصیت پرستی کی دعوت دے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص کو خدا کتاب و حکمت اور نبوت سے سرفراز کرے وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ لوگو میری شخصیت پرستی میں متبلا ہو جاؤ۔ کونوا عبادی (۷۹:۳) تمام انبیاء کی طرح محمد رسول اللہ کی دعوت بھی ﴿کونوا رٰثِیْنَ﴾ سے عبارت ہے۔ ایک ایسی دعوت جس پر ابراہیم واسمعیل، اسحق و یعقوب، ان کی نسلیں، موسیٰ و عیسیٰ اور دیگر تمام انبیاء شہادت دیتے رہے ہیں۔ جو لوگ محمدؐ پر ایمان لائے ان کے لئے تکمیل ایمان کی شرط کے طور پر یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ان انبیاء میں کوئی فرق نہیں کرتے ﴿لَا نَفَرُکَ بَیْنَ اَحَدٍ مِنْہُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران: ۸۴)۔

﴿کونوا رٰثِیْنَ﴾ کی دعوت جب اپنے محور سے ہٹ جاتی ہے اور دین داری کے نام پر گروہی عصبیت یا انبیاء اور ان کے سرکردہ متبعین کی شخصیت پرستی جز و دین قرار پاتی ہے تو دراصل اس Process کا

آغاز ہو جاتا ہے جسے ہم دین کے حوالے سے دین کی نفی کا نام دیتے ہیں۔ یا جسے عرف عام میں مذہب، مسلک یا رسومِ عبودیت کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر دین رویہ سپردگی کے بجائے شناخت قرار پاتا ہے۔ امتیں اپنے انبیاء کی شاندار تاریخ اور اس سے اپنے تعلق کو وجہ نجات قرار دے لیتی ہیں۔ اہل یہود و نصاریٰ کی ان خوش گمانیوں کا قرآن میں بکثرت بیان ملتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کا یہودی یا عیسائی ہونا ان کی نجات کیلئے کافی ہے۔ قرآن نے شناخت یا نسبت کی بنیاد پر نجات کے خیال کو مسترد کر دیا اور یہ بات واضح کر دی کہ ﴿قل یا اہل الکتاب لستم علی شئی حتی تقیموا التورۃ والانجیل﴾ (المائدہ: ۶۸)۔ رہی یہ بات کہ ربانیوں کا یہ گروہ جو نئے نبی کی قیادت میں نجات کا طالب ہے اپنے لئے جو بھی شناخت اختیار کرے تو جس طرح وقت کے مسلمانوں (اہل یہود و نصاریٰ) کی انبیائی نسبتیں ان کی نجات کیلئے کافی نہیں ہو سکتیں اور یہ دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا کہ ابراہیم و اسمعیل اور احق و یعقوب یہودی یا نصاریٰ تھے۔ اسی طرح کوئی یہ نہ سمجھے کہ محمد کوئی نئی شناخت یا نیا گروہ بنانے آئے ہیں یا ایسی کوئی شناخت ان کے متبعین کے لئے وجہ نجات ہو سکتی ہے۔ شناخت کی بنیاد پر نجات کے اس جھگڑے کا فیصلہ یوں کر دیا گیا کہ خدا کے نزدیک اہمیت عمل کی ہے ﴿ولنأعمالنا ولکم اعمالکم ونحن لہ مخلصون﴾ (البقرہ: ۱۳۹)۔ ان تمام غیر معتبر شناخت کے مقابلے میں نئے نبی کی قیادت میں ربانیوں کا جو گروہ تشکیل پایا ہے اس سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ گروہ بندی اور فرقہ پرستی سے اوپر اٹھ کر اپنے لئے ایک خدائی شناخت کو منتخب کرے ﴿صبغة الله ومن احسن من الله صبغة﴾ (البقرہ: ۱۳۸)۔ یہودی یا عیسائی شناختوں کے مقابلے میں اگر ایک نئی محمدی شناخت وجود میں آ جاتی تو یہ سب کچھ ایک عالمی ربانی پیغمبر کے شایان شان نہ ہوتا جو بیک وقت تمام پچھلے انبیاء، ان کی کتابوں پر ایمان کو لازم قرار دیتا ہو اور جو سابقین اور ان کی باقیات کو اپنا فطری حلیف گردانتا ہو۔

ربانی بنام محمدی

متبعین محمد کی ابتدائی نسلیں جب تک ربانی شناخت سے متصف رہیں ان کے فکر و نظر پر یہ خیال غالب رہا کہ وہ دینِ ابراہیمی کی نقیب اور تمام انبیائے سابقہ کی وراثتوں کی امین ہیں۔ ان کی پیش قدمی مانند سیل رواں جاری رہی۔ گم گشتہ انسانیت کے قافلے، انبیائے سابقین کے باقیات جو درجہ آخری نبی کی ربانی تحریک میں شامل ہوتے رہے۔ عام انسانوں کو ایسا لگتا تھا جیسے اس ربانی تحریک کے دروازے

ان پر واپس۔ یہ تحریک کسی مخصوص گروہ یا قوم کی سبقت یا بالادستی کی دعوت نہیں دیتی بلکہ اس کی وسعت میں پوری دنیائے انسانیت کی نجات کا سامان موجود ہے۔ خدائے واحد کی غیر مشروط بندگی کی یہ دعوت دنیائے انسانیت کو ایک دھاگے میں پروتی اور اسے ایک رشتہ اخوت میں متحد کرتی۔ اطاعت گزاروں کا یہ قافلہ جس میں تمام ہی انبیاء اور ان کے سچے متبعین شامل بتائے جاتے تھے وحدت انسانیت کی ایک ایسی آفاقی دعوت تھی جس سے ہر ذی شعور شخص خود کو منسلک محسوس کرتا۔

تمام گروہی شناخت کی نفی اور ربانی شناخت پر اصرار کا ہی نتیجہ تھا کہ متبعین محمد کی پہلی نسل بادیہ نشین عربوں کے بے سروسامان قافلے جب مختلف سمتوں میں اس صدائے انقلاب کو لے کر نکلے تو عرب و عجم، شمال و جنوب ہر جگہ ان کا والہانہ استقبال ہوا۔ عام انسانوں نے ان بادیہ نشینوں کو اپنا نجات دہندہ تصور کیا۔ انہیں اس کا خیال بھی نہ آیا کہ ربانی دعوت کے ان علمبرداروں کا تعلق کسی اجنبی تہذیب سے ہے، ان کی زبان مختلف اور ان کا طرز زندگی عرب ثقافت کا امین ہے کہ داعی اور مدعو دونوں کے لئے زبان و ثقافت، رنگ و نسل کا امتیاز، جغرافیائی سرحدیں اپنی معنویت کھو چکی تھیں۔ تب ربانی تحریک میں ہر شخص خواہ وہ عرب ہو یا عجم اپنی شرکت کے یکساں مواقع دیکھتا تھا اور اپنی نجات کے لئے یکساں امکانات پاتا تھا۔ مشترکہ پیغمبرانہ وراثت کے یہ امین جو عالمی سطح پر ایک ربانی معاشرے کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے تھے، ابتدائی دنوں میں ربانی نظام زندگی کی ایسی نظیر قائم کی جس پر نہ تو کسی خاص ثقافت کے غلبہ کا گمان ہوتا تھا اور نہ ہی کسی امپائر سازی کا شبہ کہ متبعین محمد کی پہلی نسل اپنے طرز عمل سے امپائر بلڈنگ کی نفی کرتی رہی۔

البتہ رفتہ رفتہ جب قرآن کا آفاقی پیغام اور وحدت انسانیت کی دعوت نگاہوں سے اوجھل ہوتی گئی، ربانی پیغام عرب ثقافت کے قالب میں دیکھا جانے لگا اور ہمارے علماء و دانشور اس خیال کے قائل ہوتے گئے کہ مسلم ثقافت دراصل قرآنی دائرہ فکر کا ہی فکری تسلسل ہے اور یہ کہ اسلام کے مفاد کو مروجہ مسلمانوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا، ہمارے یہاں ربانی طرز فکر کے زوال کا بگل بج گیا۔ عرب ثقافت فی نفسہ وجہ امتیاز قرار پائی اور غیر عربوں کو مولیوں کی شکل میں ربانی تحریک کی سرحد پر اکتفا کرنا پڑا۔ جب ایک بار ربانی دعوت کے بجائے خاندانی عز و شرف، نسلی تفاخر اور عرب عصبيت جیسے عوامل کو اہمیت مل گئی تو پھر ربانیوں کے اس گروہ سے صبغۃ اللہ کا وہ مجموعی تاثر زائل ہوتا گیا۔ دیگر اقوام کے مقابلے میں مسلم قومی عصبيت ایک معتبر شناخت کی حیثیت سے سامنے آئی۔ خانوادہ نبوت کے دوسرے گروہ اور سعید نفوس کے دیگر قافلے خود کو اس نئی مسلم تحریک سے الگ محسوس کرنے لگے۔ جن لوگوں نے محمد رسول اللہ کی بعثت

کے بعد بھی اپنی یہودی، عیسائی جیسی شناختوں کو باقی رکھا تھا ان کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی تو عیاں تھی البتہ اب نئی مسلم قومی عصیت کے سامنے آجانے سے خود ربانیوں کا یہ گروہ بھی فرقہ محمدی کی نفسیات سے دوچار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بین الاقوامی رسول کو جو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے ایک مسلم قومی نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ پھر بہت جلد توحید کے ان علمبرداروں میں بھی اقوام سابقہ کی طرح، اپنے نبی کے حوالے سے گروہی شناخت کے داعیے نے سراٹھایا۔ توحید کی علمبردار امت جو کبھی خدائے واحد کی بنیاد پر وحدت انسانیت کی علمبردار تھی اور جس کے دل و دماغ اس احساس سے معطر رہتے کہ وہ تمام انبیاء و رسل کی دعوتوں کا ارتکا ز ہیں۔ بد قسمتی سے وہی لوگ خود کو امت محمدی کا علمبردار سمجھنے لگے۔ اس تنگ نظری نے انہیں صرف منصب نبوت سے ہی معزول نہیں کیا بلکہ آخرت کے سلسلے میں بھی بے شمار خوش گمانیوں اور امانیات نے ان کے عقیدے میں مستقل اپنی جگہ بنالی۔

بھلا قرآن مجید سے بڑھ کر اور کون سا مستند وثیقہ ہو سکتا ہے جو محمد رسول اللہ کی غایت بعثت کی تشریح و تعبیر کر سکتا ہو۔ دقتیں کی اس کتاب میں، جو آج تک پوری صحت کے ساتھ امت کو منتقل ہوتی رہی ہے، امت محمدیہ جیسی کوئی اصطلاح نہیں پائی جاتی۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں رسول اللہ کو ایک ایسے نبی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جو دین ابراہیمی کے احیاء کے لئے بھیجا گیا ہو اور جو اہل کتاب کے دیگر گروہوں کے مقابلے میں دین ابراہیمی کا سب سے مستند پیروکار ہے۔

امت محمدی کا نو تراشیدہ تصور اس بات سے عبارت تھا کہ اب تاریخ کے آخری لمحے تک صبحۃ اللہ کے حاملین کے بجائے ایک ایسی قوم اپنے غلبہ اور سیادت کی تیاری کر رہی ہے جو محمد رسول اللہ کی باقیات میں سے ہے۔ ظاہر ہے دوسری اقوام کے لئے امت محمدی کے سیاسی غلبہ یا اس کی عالمی قیادت میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر آنے والے دنوں میں اس قومی شناخت کی بنیاد پر اموی اور عباسی سلطنتوں کے جاہ و حشم، اسپین اور دہلی میں امت محمدیہ کے سیاسی عروج اور عثمانی ترکوں کی قیادت میں ملک گیری کی توسیع کا جو منظر سامنے آیا اس سے بھی یہی کچھ مترشح ہوتا تھا کہ امت محمدیہ دوسری اقوام پر اپنے سیاسی، عسکری اور تہذیبی تفوق کیلئے کوشاں ہے۔ بظاہر مسلم ریاستوں کی سرحدیں وسیع ہوتی رہیں، عرب مسلم تہذیب و ثقافت کے مرکز میں علم و فن کے چراغ کی مسلسل تیز ہوتی رہی، مگر فی الواقع نظری اعتبار سے متبعین محمد کی یہ تسلیں مسلسل زوال فکر و نظر سے دوچار تھیں، جہاں منصب کار رسالت سے منہ موڑ کر اب ان کے ارباب حل و عقد اپنی کھال میں مست تھے۔ گروہی انداز فکر نے خود بین المسلمین خانہ جنگی کی کیفیت پیدا

کر دی تھی۔ جو لوگ کبھی وحدتِ انسانیت کے علمبردار تھے اب وہی لوگ آپس میں شیعہ سنی، حنفی شافعی شناختوں کے حوالے سے خونریز تصادم میں مبتلا ہو گئے۔ اس صورتِ حال نے اموی سلطنت کی بساط لپیٹ دی، عباسی سلطنت کا چراغ گل کر دیا۔ نظری اعتبار سے امت اتنے مختلف گروہوں میں بٹ گئی کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہو گیا کہ حق پر کون ہے اور کسے واقعی محمد رسول اللہ کا سچا امین کہا جاسکتا ہے۔ اہل فکر و نظر مسلسل اس خیال کا اظہار تو کرتے رہے کہ ہمارے تاریخی سفر میں کہیں کوئی بنیادی گڑبڑی ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے ہر اگلا قدم ہمیں اپنی منزل سے مزید دور کر دیتا ہے۔ مگر اصلاحِ احوال کے لئے جتنی بھی کوششیں ہوئیں ان کا لب لباب یہی تھا کہ امتِ محمدی کو کسی طرح غلبہ و تفوق عطا کر دیا جائے۔ اس خیال کی طرف توجہ کم ہی گئی کہ ربانی امت کا جو تصور ہمارے دل و دماغ سے محو چکا ہے اور جس کی وجہ سے ہم گروہی انداز سے سوچنے اور محدود گروہی نتائج پیدا کرنے پر مجبور ہیں، اس آفاقی نقطہ نظر کی از سر نو تشکیل کا کام کیسے انجام دیا جائے۔

امت مسلمہ کے وسیع آفاقی تصور سے دست کشی اور امتِ محمدی کے نئے نظری خول کی تعبیر نفسیاتی اور فکری ہر دو سطح پر پسپائی سے عبارت تھی، جس نے بہت جلد تبعینِ محمد کی اگلی نسلوں کو منصبِ سیادت سے معزول و معطل کر کے رکھ دیا۔ جب تک مسلمانوں کی موجودہ نسل کو کارِ نبوت کے اعلیٰ منصب کا پھر سے ادراک نہیں ہوتا اور ان کے دل و دماغ اس خیالِ تقلیب انگیز سے مامور نہیں ہوتے کہ وہ رحمۃ للعالمین کے امین، تمام انبیائی تحریکوں کے نکتہ ارتکاز اور تاریخ کے آخری لمحے تک انسانیت کی عمومی فلاح و نجات کی خاطر معبود کئے گئے ہیں تب تک وہ امتِ محمدی کے نفسیاتی گنبد میں خود کو مقید رکھنے پر مجبور پائیں گے۔

امت مسلمہ بنام امت محمدیہ

امت مسلمہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، جس کی تشریح و تعبیر اس دعائے براہیمی سے ہوتی ہے ﴿ربنا واجعلنا مسلمین لك ومن ذریتنا امۃ مسلمة لك و اٰرنا مناسكنا و تب علینا انك انت التواب الرحیم﴾ (البقرة: ۱۲۸) اس دعا کی مزید تفسیر کرتے ہوئے اگلی آیتوں میں مزید ارشاد ہے کہ جو دینِ براہیمی سے بے رغبتی کرے گا وہ دراصل اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا ہے۔ وہی ابراہیم جس کی اطاعت پر خود قرآن نے گواہی دی کہ جب اس سے کہا گیا کہ اطاعت گزار بن تو بول اٹھا ﴿اسلمت لرب العالمین﴾۔ بات یہیں ختم نہیں ہو گئی بلکہ اطاعت گزاری کی یہ روایت انہوں نے آگے بڑھائی۔ ابراہیم اور

یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيعُوْا اَمْرًا مِّنْ اللّٰهِ اَطِيعُوْا اَمْرًا مِّنْ الرَّسُوْلِ اَطِيعُوْا اَمْرًا مِّنْ اٰمِلِكُمْۢ بَعْدِيْ﴾ (البقرة: ۱۳۲) کہ تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم اطاعت گزاروں میں سے ہو۔ حضرت یعقوب جب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کے دل و دماغ پر بھی یہی فکر سوار تھی کہ میرے بعد ایسا نہ ہو کہ میرے بچوں کی اطاعت گزاری میں کوئی کمی واقع ہو جائے لہذا دنیا سے جاتے ہوئے انہوں نے اپنی اولاد سے اس بارے میں اطمینان حاصل کرنا مناسب جانا۔ بچوں کا یہ جواب ﴿نَعْبُدُ اللّٰهَ وَآلِهَ اَبَائِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاسْمٰعِيْلَ وَاسْحٰقَ الْهٰا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ (البقرة: ۱۳۳) اس دعائے براہیمی کا تسلسل ہے جس میں ابراہیم نے اپنی ذریعات میں سے امت مسلمہ اٹھانے کی التجا کی تھی۔

قرآنی بیان کے مطابق امت مسلمہ دراصل خانوادہ نبوت اور ان کے سچے متبعین پر مشتمل ایک ایسا گروہ ہے جس نے تاریخ کے ہر لمحے میں اور دنیا کے ہر خطے میں غیر مشروط اطاعت گزاری کی ریت کو برقرار رکھا ہے۔ اطاعت گزاروں کا یہ گروہ زمان و مکان، نسلی، لسانی اور جغرافیائی سرحدوں سے بے نیاز ہے۔ جس نے سچی اطاعت اختیار کی اللہ نے اسے اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ اطاعت گزاروں کے اس قافلے میں شامل ہونے اور قرب الہی کی بشارت کا مستحق قرار پانے کیلئے کسی کا عورت یا مرد ہونا بھی اس راہ کی رکاوٹ نہ بن سکا، ﴿يٰۤاَمْرِيْمَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكَ وَطَهَّرَكَ وَاصْطَفٰكَ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (آل عمران: ۴۲) یا حضرت آسیہ کو آنے والی نسلوں کیلئے بطور نمونہ پیش کرنا اسی خیال کی تصدیق ہے کہ خدا کے نزدیک اطاعت گزاروں کے قافلے میں شمولیت کے لئے عمل کی ہی اہمیت ہے۔ دوسری تمام باتیں یا حوالے کچھ معنی نہیں رکھتے لہذا جو لوگ ﴿كُونُوا هٰودًا وَّ نَصَارًا﴾ پر اصرار کرتے ہیں یا جو امت محمدیہ سے نسبت کو نجات کے لئے کافی سمجھے بیٹھے ہیں ان کے لئے یہ تنبیہ و تحذیر ہے ﴿قُلْ بَلْ مَلِئْتُ اَبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾ کہ وہ بلا پس و پیش ابراہیمی طریقے کو اختیار کر لیں۔ امت مسلمہ سے الگ کسی نبی کو فرقہ بندی کی عینک سے دیکھنا یا اس پر یہودی، نصرانی یا محمدی شناخت کے علمبردار ہونے کا الزام عائد کرنا، ایک ایسی بے اصل بات ہے جس کی تنبیہ کرتے ہوئے قرآن انبیائے سابقین کے متبعین سے کہتا ہے ﴿وَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَم اللّٰهُ﴾ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ انبیاء پر اس طرح کی گروہ بندی کا الزام عائد کرنا دراصل بہت بڑا ظلم ہے حقیقت سے جان بوجھ کر چشم پوشی ہے۔ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةَ عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (البقرة: ۱۴۰)۔

یہ ہے امت مسلمہ کا وہ تصور جو قرآن کے صفحات سے برآمد ہوتا ہے۔ ابراہیم و اسمعیل، اسحاق

و یعقوب اور تمام انبیائے سابقین اور ان کے سچے تبعین کی ایک جگہ گاتی کہکشاں۔ جس طرح ﴿محمد رسول اللہ والذین معہ﴾ (الفتح: ۲۹) آنے والی تاریخ میں سیادت پر فائز کئے گئے ہیں اسی طرح ﴿ابراہیم و اسماعیل، اسحاق و یعقوب والاسباط﴾ (النساء: ۱۶۳) پر مشتمل راہ یاب قدسی نفوس کے اس وسیع مجموعے کا نام امت مسلمہ ہے۔ جو لوگ پھر بھی اس بات پر اصرار کریں کہ امت مسلمہ سے مراد صرف امت محمدیہ یا اس سے نسلی تعلق رکھنے والے لوگ ہیں کیا وہ اس بات کی جسارت کر سکتے ہیں کہ براہیمی سلسلے کے دوسرے انبیاء کے تبعین یا آسیہ و مریم جیسی سپردہ نفوس کو امت مسلمہ کے اس وسیع دائرے سے باہر کر دیں۔

صرف اطاعت گزاروں کے لئے اہل ایمان یا اہل اسلام کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ اہل کفر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں سے توحید کا دامن جاتا رہا، گو یا جبل اللہ سے ان کا تعلق ٹوٹ گیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی پراگندگی فکر و نظر کی وجہ سے اب کسی عمل صالح کے لائق نہیں رہے۔ دائرہ توحید سے ایک بار باہر آ جانا فساد فکر و نظر کا ایک لانتنا ہی سلسلہ قائم کر دیتا ہے۔ انبیاء کی وارث قویں بھی اگر شرک کے راستے پر چل نکلیں تو ان کا شمار اطاعت گزاروں میں نہیں ہو سکتا۔ ﴿لقد کفر الذین قالوا ان اللہ هوالمسیح ابن مریم﴾ (المائدہ: ۱۷) یا ﴿لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثة﴾ (المائدہ: ۷۳) جیسی آیتیں اس بات پر دال ہیں کہ خود کو اہل ایمان کہلانے والے لوگ بھی اگر توحید سے دست کش ہو جائیں تو ان کے اس صریح کفر کو خوشنما اصطلاحات یا فقہی معاریض میں نہیں چھپایا جاسکتا اور نہ ہی ان کا یہ کہنا ان کی نجات کی ضمانت بن سکتا ہے کہ ﴿نحن ابناء اللہ واحباؤہ﴾ (المائدہ: ۱۸)۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے توحید کا دامن تھام لیا اور عمل صالح میں لگے رہے تو ان کیلئے کسی رنج و غم کی ضرورت نہیں۔

سورہ انبیاء میں انبیائے سابقین کے تذکرے اور ان کی اطاعت گزاری کے بیان کے بعد صریح الفاظ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ﴿ان هذه امتکم امة واحدة﴾ (المؤمنون: ۵۲) اطاعت گزاروں کا یہ طویل سلسلہ جس میں ابراہیم سے لیکر لوط و سلیمان، ایوب و اسمعیل، ادریس و ذوالکفل، ذوالنون و زکریا، یحییٰ اور مریم جیسے پاکیزہ نفوس شامل ہیں، دراصل یہ ایک ہی امت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے آپس میں گروہ بندی کر لی ﴿فتقطعوا امرہم بینہم﴾ (المؤمنون: ۵۳) البتہ ان سبھوں کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے سو ان میں سے جو کوئی نیک عمل کرے گا اور وہ اہل ایمان میں سے ہوگا، تو اس صریح وضاحت کے بعد اس بات کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے کہ اہل توحید پر مشتمل اس ایک امت سے انبیائے سابقین کے سچے تبعین کو خارج کر دیا جائے ﴿کان الناس امة واحدة﴾ (البقرة: ۲۱۳)، ﴿ان هذه امتکم امة واحدة﴾ کے

تفاظ میں ﴿ان ابراہیم کان امة قانتا﴾ (النحل: ۱۲۰) کے قرآنی بیان کو ملاحظہ کیجئے۔ وہی ابراہیم جو اہل توحید کے قافلے میں ایک خاص فضیلت کے حامل ہیں جن کی غیر مشروط اور بے مثال اطاعت گزاری پر خود قرآن گواہ ہے۔ اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ وہ اپنے اندر ابراہیم جیسے ایمان کی شان پیدا کریں۔ جو تمام جھوٹی شناختوں سے ماوراء رب کائنات کی عبودیت کا سچا رنگ لئے ہوئے ہے۔ دین ابراہیمی کے حاملین اور انبیاء سابقین کے تمام متبعین اسی راستے پر گامزن ہیں جس کی دعوت محمد رسول اللہ دے رہے ہیں۔ جن کے تذکرے سے توراۃ وانجیل کے صفحات پُر ہیں۔ ﴿الذین يتبعون الرسول النبي الامی الذی یحدونہ مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل﴾ (الاعراف: ۱۵۷)۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اطاعت گزاروں کے اس قافلے میں مختلف چھوٹی چھوٹی امتیں پیدا ہو جائیں، خدا کے یہ برگزیدہ بندے جھوٹی گروہی شناخت میں مبتلا ہو جائیں کہ ایسا کرنا شرک کا دروازہ کھولنا ہے۔

امت مسلمہ کا یہی وہ ہمہ گیر تصور ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں انبیائے سابقین کی باقیات کے لئے ہمیشہ خیر سگالی کے جذبات کو برقرار رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ان ایام میں بھی جب اصحاب رسول کو اہل کتاب کے بعض گروہوں کی سخت مخالفت کا سامنا تھا، ان جنگی حالات میں جب نزول قرآن کے وقت اہل یہود کے بعض گروہ مسلسل ریشہ دوانیوں میں مبتلا تھے، قرآن نے اہل کتاب کے ان سعید نفوس کی ستائش سے اجتناب نہیں کیا جو خود اپنے ہم قوموں کے برعکس خدا ترسی کی راہ پر گامزن رہے ﴿لیسوا سواء من اهل الکتاب امة قائمة یتلون آیات اللہ﴾ (آل عمران: ۱۱۳) یا ﴿ومن قوم موسیٰ امة یهدون بالحق﴾ (المائدہ: ۱۵۹) جیسی آیات اسی بات کو ذہن نشین کراتی ہیں کہ انسانوں کو محض کسی قومی شناخت کی بنیاد پر اہل کفر یا اہل ایمان کی گروہوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ جو خدا ﴿ان اکرمکم عند اللہ اتقکم﴾ کی بشارت دیتا ہو اور جس کا وعدہ ہو کہ ﴿لاتروروا زرة و زرا اخری﴾ وہ بھلا یہ کیسے پسند کر سکتا ہے کہ کسی شخص کی نسلی یا گروہی شناخت اس کے عمل صالح کو ساقط الاعتبار قرار دینے کا سبب بن جائے۔ اہل ایمان خواہ وہ کسی بھی تہذیب میں پائے جاتے ہوں ان کے لئے تو قرآن میں واضح بشارت موجود ہے ﴿ان الذین امنوا والذین ہادوا والنصری والصابیین من امن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلہم اجرہم عند ربہم ولا خوف علیہم ولا ہم یحزنون﴾ (البقرہ: ۶۲)۔

قرآن کی یہ آیت جس میں فلاح و کامرانی کی بشارت کا دائرہ اُمم سابقہ کے خدا ترسوں تک وسیع کر دیا گیا ہے، بعض اصحاب علم و دانش کے لئے سخت ذہنی خلجان کا باعث بنتی رہی ہے۔ ہمارے خیال میں

اس خلیفان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان محمد رسول اللہ کی دعوت کو تمام انبیائے سابقین کے ارتکاز کے طور پر دیکھنے کا رواج کم ہی رہا ہے۔ حالانکہ قرآن باسالیب مختلف اس مجموعی تاثر کو بار بار ذہن نشین کراتا ہے کہ محمدؐ دین براہیمی کے داعی ہیں جنہیں امت مسلمہ کے احیاء اور تاریخ کے آخری لمحے تک اس کی قیادت پر مامور کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام جو تمام انبیاء کے ذریعے بلند کیا گیا کلمہ حق ہے، اس کا محور و مرکز خدائے واحد کی پرستش ہے یہ ایک God-centered دین ہے، جہاں انبیاء علیہ السلام کی جگہ گاتی کہکشاں میں کسی نبی کو کسی نبی پر فوقیت نہیں دی جاتی۔ خدا کے سچے پرستار سبھیوں پر بیک وقت ایمان لاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اسلام کو محمد الاصل Mohammad-centered دین کی حیثیت سے دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو دراصل ان کے ذہنوں پر St. Augustine جیسے عیسائی راہبوں کے عقائد کا سایہ ہے جنہوں نے اپنی تبلیغی اور فکری کاوشوں سے حضرت مسیح کو نجات کے لئے بنیادی پتھر باور کرا رکھا ہے اور اس طرح عیسائی تصور کائنات میں نجات صرف فرقہ عیسوی کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید نجات جیسے مسئلہ کو سرے سے انسانی بحث و تحقیق کے دائرے سے باہر قرار دیتا ہے۔ روزِ آخر کون جنت میں جائے گا اور کسے واصل جہنم کیا جائیگا، یہ وہ حساس امور ہیں جن پر کوئی قول فیصل انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اہل کتاب کو تو چھوڑیے، انہیں تو قرآن دین محمدی کے فطری حلیف کے طور پر پیش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے دامن شرک سے آلودہ ہو گئے ان کیلئے بھی خدا کا ارشاد ہے کہ سزا و جزا کا یہ فیصلہ وہ بذاتِ خود روزِ حشر انجام دے گا۔ اس بارے میں کوئی گفتگو انسانوں کے دائرہ اختیار سے باہر ہے: ﴿ان الله يفصل بينهم يوم القيامة﴾ (الحج: ۱۷)۔

جس طرح مختلف شعوب و قبائل سے انسانوں کا تعلق محض تعارف کیلئے ہے ﴿وجعلناکم شعوبًا وقبائل لتعارفوا﴾ (الحجرات: ۱۳) اسی طرح یہ بھی خدائی اسکیم کا ایک حصہ ہے کہ اس کے سچے بندے مختلف دینی شناخت کے ساتھ جانے جائیں: ﴿ولو شاء الله لجعلهم امة واحدة﴾ (الشوری: ۸) اگر خدا ترسوں کے مختلف گروہ انبیائے سابقین کی باقیات و ذریات، خود کو راہِ یابی کے مختلف سلسلوں سے وابستہ پاتے ہوں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ توراۃ و انجیل بھی اسی خدا کی کتاب ہے اور وہاں بھی ہدایت اور روشنی موجود ہے۔ انبیائی پیغام سے اپنا تعلق بتانے والوں کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی نجات کا فیصلہ کرنے کیلئے بیٹھ جائیں یا اس خیال کی وکالت کرنے لگیں کہ لوگو! یہودی اور عیسائی ہو جاؤ نجات اسی میں ہے اور جو اس شناخت سے باہر رہ گیا اس کیلئے نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ اس کے برعکس قرآن کا مطالبہ

ہے کہ انبیائی ہدایت کے امین، مختلف تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں، غیر ضروری مباحثے میں اپنی قوتوں کو ضائع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کریں کہ وہ ایک دوسرے پر نیکی کے کاموں میں سبقت لے جائیں۔ خدا کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ تمام انسانوں کو یا اہل حق کے تمام ہی گروہوں کو ایک امت بنا دیتا لیکن اس کی تو اسکیم یہ ہے کہ جس امت کو جو دیا گیا ہے اسی کی بنیاد پر اسے آزمائے:

﴿وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِى مَا آتَاكُم فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (المائدہ: ۴۸)۔

مسلمانوں کی پہلی نسل جو انبیائی سلسلے میں محمد رسول اللہ کے مقام عظمت سے واقف تھی اس نے ان امور کو کبھی معرض بحث نہیں بنایا کہ روز محشر انبیائے سابقین کے مقبوعین کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس اہل کتاب کے حوالے سے وہ اس دعوت کے امین رہے کہ اے اہل کتاب آؤ ان بنیادی باتوں کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا۟ اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نَشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاَنْ تَتْلُوْا فِقُولَآ اَشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران: ۶۴)۔

جو لوگ انسانیت کی سیادت پر فائز کئے گئے ہوں ان کے مقام بلند کا یہ فطری تقاضہ تھا کہ وہ اہل حق کے تمام ہی گروہ کو وسعت قلبی کے ساتھ قبول کریں۔ تمام اہل حق پر نئی نبوی تحریک میں شرکت کا دروازہ کھلا رکھیں تبھی یہ ممکن ہے کہ انبیائے سابقین کے سچے اور جھوٹے دعویدار الگ ہو سکیں۔ جو لوگ واقعی خدا شناس ہوں گے وہ ”فاستبِقُوا الْخَيْرَاتِ“ کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔ ربانی تحریک کی راہ میں ایسے خدا شناس لوگ مزاحم نہیں ہو سکتے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے یہودی یا نصرانی نسبتوں کو ہی وجہ نجات سمجھ رکھا ہے تو ان کیلئے صاف صاف بتا دیا گیا کہ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتٰى تُقِيْمُوْا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اَنْزَلَ الْيَكْمَ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (المائدہ: ۶۸)۔ یہ نام نہاد اہل کتاب جو دین کے نام پر گروہی عصبیت جیسی لعنت میں مبتلا ہیں اور جن کا فرقہ ہی ان کے لئے الہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تو شرک کے مارے ان نام نہاد وارثین انبیاء سے تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گروہی عصبیت کا یہ زہر اور ان کی تنگ رجعت پسندانہ ذہنیت تمہیں بھی اپنی لپٹ میں لے لے۔ سو اہل ایمان کو تلقین ہے کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرَىۤ اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٌ﴾ (المائدہ: ۵۱)۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ اس قسم کے قرآنی بیانات اہل کتاب کی طرف کسی عمومی بیان کے مظہر ہیں کہ قرآن میں جابجا باقیات انبیائے سابقین کو نہ صرف یہ کہ شرکت عمل کی دعوت دی گئی ہے بلکہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے

مکنہ شبہات کا بھی ازالہ کر دیا گیا ہے ﴿لیسوا سواءاً من اهل الکتاب امة قائمة یتلون ایت الله اثناء الیل وهم یسجدون﴾ (آل عمران: ۱۱۳)۔

یہ بات کہ اہل کتاب مسلمانوں کے فطری حلیف ہیں ابتدائی عہد میں ایک امر مسلمہ کی حیثیت سے تسلیم کی جاتی تھی۔ قرآن نے اہل کتاب سے موالات کی راہ کھلی رکھی تھی۔ ان کا کھانا پینا مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیا گیا تھا حتیٰ کہ معاشرتی تعلقات کے قیام کیلئے بھی صریح قرآنی ہدایات موجود تھیں۔ عفت مآبی کی شرط کے ساتھ اہل کتاب کی عورتیں بھی عفت مآب مسلمان عورتوں کی طرح حلال قرار دی گئی تھیں ﴿الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لہم والمحصنت من المومنات والمحصنت من الذین اتوا الکتاب من قبلکم﴾ (المائدہ: ۵)۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں تقویٰ اور پاکیزگی کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تنظیم نو کی جارہی ہو، جہاں گروہی نسبتیں، نسلی تفاخر اور جھوٹی دینی شناخت کا عدم قرار دی جارہی ہو، یہودی، عیسائی یا قومی مسلمان بنانے کے بجائے ربّانی بنانے کا غلغلہ بلند ہو، کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ آنے والے دنوں میں تبعین محمد کا یعنی افق اس قدر تنگ ہو جائے گا کہ ان کی نسلیں اپنے لئے ایک قومی شناخت کو گوارہ کر لیں گی اور مسلم ہونا ان کے درمیان رویے کے بجائے شناخت بن کر رہ جائے گا۔ بد قسمتی سے بعض سیاسی حوادث اور تاریخی عوامل نے آنے والے دنوں میں ایک ایسے ہی تنگ نظر متعصب قومی شناخت کی راہ ہموار کر دی جس کے لئے جلد ہی روایات و تاریخ کے ماخذ اور فضائل سے متعلق تراشیدہ قصوں نے ایک مستقل نظام فکر مرتب کر ڈالا۔ امت مسلمہ جو خود کو تاریخ کے آخری لمحے تک قیادت کے منصب پر فائز سمجھتی تھی اور جو اہم سابقہ کی باقیات کو اسی قائدانہ وسعت نظری سے دیکھتی تھی رفتہ رفتہ انہیں رقیب تصور کرنے لگی۔ امت محمدیہ کی نفسیات کے جنم لینے سے نہ صرف یہ کہ قائدانہ نفسیات اور وسعت نظری کا خاتمہ ہو گیا بلکہ مسلمانوں کے ذہنوں پر یہ بات نقش ہونے لگی کہ وہ بھی دوسری امتوں کی طرح ایک امت ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح قومی مسلمانوں نے بھی اپنی امت کو دوسری امت سے افضل باور کرانے کی خاطر خوش گمانیوں پر مشتمل روایات کی بھرمار کر ڈالی۔ حتیٰ کہ ایسی روایتیں بھی وجود میں آ گئیں جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ روز قیامت کس طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان بآسانی داخل جنت کئے جائیں گے۔ ایسا اس لئے کہ بعض روایتیں محمد رسول اللہ کو شفاعت کے اس منصب پر فائز کرتی تھیں جس کا یارا ابراہیم اور دوسرے انبیاء کو نہ تھا۔ بعض روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ اس دن لواء الحمد صرف محمدؐ کے ہاتھ میں ہوگا جو اپنی امت کی خاطر خصوصی شفاعت کے لئے

سارا زور صرف کر دیں گے۔ جیسا کہ بعض روایتیں بتاتی ہیں ایسا محسوس ہوگا کہ گویا عام مسلمانوں کے ساتھ بھی انبیائے بنی اسرائیل جیسا معاملہ کیا جا رہا ہے۔

امت مسلمہ کے منصبِ عظیم سے بہت نیچے لا کر امت محمدی کی قومی عصیت کو فروغ دینے کے لئے جو روایتیں وضع کی گئیں اس میں اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا گیا کہ اس کی زور رسول اللہ کے منصبِ عظیم پر کس طرح پڑتی ہے۔ جو نبی تمام انسانیت کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا اور جس کے رحمۃ للعالمین ہونے پر خود قرآن شہاد ہے اور جس کے بغیر آنے والی ساری انسانی تاریخ بے معنی ہے، اس نبی کے بارے میں مسلمانوں میں یہ تصور عام ہوا کہ وہ دنیا سے بھی امتی امتی کرتا رخصت ہوا اور روزِ حشر بھی اپنی امت کو باریاب کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ جب رسول ﷺ کے بارے میں یہ خیال عام ہو کہ وہ عام انسانیت کے بجائے صرف اپنی امت کی فلاح و بہبودی کو مطلوب و مقصود جانتا ہو تو بھلا اس کے قبیحین کے لئے یہ کیسے ممکن ہوتا کہ وہ اپنے تراشیدہ خولِ مسلمانی سے باہر آ کر عام انسانیت کی نجات کی فکر اور اسے ہانکے پکارے فلاح و کامرانی کی طرف بلا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیادت پر فائز امت اپنی پیدا کردہ امانیات اور خوش گمانیوں کے زیر اثر خود ساختہ معزولی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔



متبعین محمدؐ کی ابتدائی نسلیں جب تک ربانی شناخت سے متصف رہیں ان کے فکر و نظر پر یہ خیال غالب رہا کہ وہ دینِ براہمی کی نقیب اور تمام انبیائے سابقہ کی وراثتوں کی امین ہیں۔ ان کی پیش قدمی مانند سیلِ رواں جاری رہی۔ گم گشتہ انسانیت کے قافلے، انبیائے سابقین کے باقیاتِ جوق در جوق آخری نبی کی ربانی تحریک میں شامل ہوتے رہے۔ عام انسانوں کو ایسا لگتا تھا جیسے اس ربانی تحریک کے دروازے ان پر وا ہیں۔



پہلی نسل کے مسلمان حریتِ فکر کی لذت سے آشنا تھے۔ عام مسلمان اپنے قائدین اور اہل علم پر تنقیدی نگاہ ڈالنا اپنا حق سمجھتے۔ حتیٰ کہ عین خطبہ کے دوران ایک اعرابی عورت خلیفہ کو ٹوک دینا اپنا حق سمجھتی۔ مسلمانوں میں حریتِ فکر کی روایت جب تک باقی رہی ان کی نگاہیں اصحابِ علم و فن سے ماوراءِ وحی کے اوراق میں ہدایت کی طالب رہیں۔ البتہ جب سے اصحابِ علم و فن نے اپنے آپ کو عام انسانوں سے الگ ایک مقدس مخلوق کی حیثیت سے پیش کرنے کی طرح ڈالی اور ان کے ناموں کے آگے پیچھے تقدس مآب القاب و آداب کی طویل قطار وجود میں آنے لگی مسلم ذہن پر تقلید کی دھند دبیز ہوتی گئی۔

اس شرک سے نجات کا بھی کوئی راستہ ہے؟

مسلمان مجموعی طور پر شرک کے گردابِ شر میں گرفتار ہیں۔ سیادتِ عالم کے منصبِ جلیل سے ان کی معزولی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ توحیدِ خالص کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے۔ شرک کے نتیجے میں برگزیدہ قوموں پر جو عذاب آتا ہے اور جس طرح ان کی ہوا اُکھڑتی ہے اس کا مشاہدہ آج مسلمانوں کے حوالے سے چہار دانگ عالم میں کیا جاسکتا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں مسلمانوں کے مضطرب ذہن مختلف لب و لہجے میں اپنے آپ سے پوچھتے رہے ہیں کہ کیا خدا اب ان کا ساتھ چھوڑ چکا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کا خون ارزاں اور ان کی غیرت سستی ہوگئی ہے؟ حالیہ برسوں میں افغانستان اور عراق میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس نے اس سوال کی دھار اور بھی تیز کر دی ہے کہ خدا نے آخری پیغام کے حاملین پر سے اپنی شفقت و نصرت کا ہاتھ کیوں اٹھالیا ہے۔ اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب دیا جانا ابھی باقی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل یہود کی طرح ہم مسلمان بھی اپنی معزولی کے باوجود خود کو خیر امت کے منصبِ جلیل پر فائز سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، حالانکہ آج جو لوگ دنیا کے سیاہ و سفید کا فیصلہ کر رہے ہیں وہ بد قسمتی سے ہم نہیں ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری تمام تر گمراہی چونکہ مصنوعی مذہبیت کے جلو میں آئی ہے اس لیے حقیقتِ واقعہ کا صحیح اندازہ کرنا عام لوگوں کے لیے تو کیا خواص اور علماء کے لیے بھی دشوار ہو رہا ہے۔ کہنے کو تو پوری امت دین پر عمل پیرا ہے یا کم از کم دین کے حوالے سے اس کے اندرون میں مختلف مذہبی تحریکیں جاری و ساری ہیں، لیکن اگر حقیقت شناس نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ سب ایک سنگین دھوکے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

توحیدِ انسانوں کو جوڑتا اور شرک انھیں ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ توحیدی طرزِ فکر انسانوں کو ایک

خدا اور اس کے ربانی نظام میں پرونا چاہتی ہے، جبکہ شرک پسند ذہن انسانوں کو خانوں میں بانٹنے اور ان کی گروہ بندیوں کے لیے مختلف حیلے تلاش کر لیتا ہے۔ پچھلے انبیاء کی امتیں جن کی طرف بھی توحید خالص کی یہی دعوت بھیجی گئی تھی اپنی من مانی تشریح و تعبیر کے نتیجے میں گروہوں میں بٹ چکی تھیں۔ قرآن کا بیان ہے کہ رسول اللہ کی آمد سے ان گروہ بندیوں اور اختلاف کا خاتمہ ہوا اور توحید کی تجدید نے ان کے اندر پھر سے ﴿فَالْف بَيْنَ قُلُوبِكُمْ﴾ کا ماحول پیدا کر دیا۔

شرک کا یہ قالب کہ وہ مذہب کے حوالے سے اہل مذہب کے دل و دماغ پر اپنے ڈیرے جمائے انسانی تاریخ میں نیا عمل نہیں ہے۔ درختوں کی پرستش اور سورج، چاند کی پوجا ایک ایسا کھلا شرک ہے جسے عام نگاہیں بھی دیکھ لیتیں ہیں۔ البتہ دین کے نام پر فرقہ بندی یا کسی خاص تعبیر دین کو دین قرار دینا اور اس کی پرستش میں مبتلا ہو جانا ایک ایسا عمل ہے جس کی سنگینی کا اندازہ ہر خاص و عام کو نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی مجموعی صورت حال پر نظر ڈالنے آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں۔ کہیں یہ جنگ زبانی ہے، کہیں اس میں الفاظ اور فتاویٰ کے گولے بارود استعمال ہو رہے ہیں اور کہیں عین حالت نماز میں مسجدوں کے اندر ایک مسلک کا مسلمان دوسرے مسلک کے مسلمان کو بلا تکلف گولیوں کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتا۔ دین کے نام پر دنیا بھر میں جو مدارس قائم ہیں ان پر کسی خاص طرز فکر یا مسلک کا رنگ غالب ہے۔ قال اللہ وقال الرسول کے جلو میں ان کی اصل کوشش اس بات کی ہے کہ وہ اپنے فرقے کو حق اور دوسروں کو باطل ثابت کریں۔ یہ سلسلہ صرف ہندوستان تک ہی موقوف نہیں پوری مسلم دنیا بلکہ یورپ اور امریکہ میں جو مسلمانوں کے ادارے قائم ہوئے ہیں سب کے سب اسی گروہ بندی میں مبتلا ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ الہ واحد کی بندگی کے بجائے ایک طرح کی cult-worship میں مبتلا ہیں۔ ان کے لئے ان کے فرقے یا گروہ اور مسلک نے ہی الہ کا مقام حاصل کر رکھا ہے اور وہ اپنے اکابرین کی تشریح و تعبیر کو پیغمبرانہ حد تک سچ سمجھنے لگے ہیں۔ اسی صورت حال کا بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَفِرُّوْا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَّسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ یعنی جن لوگوں نے دین میں فرقہ بندی کی اور گروہوں میں بٹ گئے ان کا (اے محمد) آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ (الانعام: ۱۵۹)

ہماری موجودہ دین داری جس پر بدقسمتی سے گروہ بندی اور مسالک کا رنگ نمایاں ہے، ہماری مساجد اور مدارس جس طرح مسالک اور فرقوں میں بٹ گئے ہیں یا جس طرح ہم دین کی فقہی تعبیر کے نام پر آج خود کو حنفی اور شافعی کے خانوں میں پاتے ہیں اس کے بعد اس حقیقت کا ادراک کرنے میں کچھ زیادہ

دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ ﴿حیل اللہ﴾ ہمارے ہاتھوں سے پھسل چکی ہے۔ اس بھری پری کائنات میں آج کون ہے جو لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلا رہا ہو۔ ہر مسجد کے منبر سے اور مدرسہ کے مسند ارشاد سے بس اسی بات کی دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ ہمارے فرقے میں شامل ہو جاؤ، دین خالص کے علمبردار تو ہم ہی ہیں۔ کہنے والوں کو اس بات کا شعور نہیں کہ دین کے نام پر وہ کس بدترین قسم کی فرقہ پرستی میں مبتلا ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کے تمام ہی گروہ یا فکری حلقے اپنی دینی مشین کو متحرک رکھنے کے لیے اپنے اکابرین کی کتابوں پر انحصار لازم خیال کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود بھی کیا اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ کسی فقیہ و مفسر یا امام یا اہل دل کی کتابوں کو فہم دین میں سند کا مرتبہ حاصل ہو۔ ہمیں تو واضح الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ﴿لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾ (آل عمران: ۱۰۵) یعنی ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو بیّنات آجانے کے بعد بھی فرقہ بندی اور اختلاف کا شکار ہو گئے، ایسے لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔

آج اُمت مسلمہ جس دردناک عذاب میں گرفتار ہے وہ تفرقہ اور اختلاف کا لازمی نتیجہ ہے۔ الہی پیغام کی حامل قوموں نے جب بھی دین کی تعبیر کے نام پر گروہ بندی کو جائز قرار دیا وہ دین کے حوالے سے cult-worship میں مبتلا ہو گئیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمام انبیاء پر ایک ہی دین بھیجا گیا اور انھیں یہ تاکید کر دی گئی کہ ﴿أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾ یعنی وہ اُسے قائم رکھیں اور اس میں پھوٹ نہ ڈالیں۔ رسول اللہ کو جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کے نام لیوا تھے۔ ان کے یہاں رسی دین داری کی کمی نہ تھی۔ البتہ وہ دین ہی کے نام پر بدترین قسم کے تفرقے میں مبتلا تھے۔ ان سابق اہل ایمان کی ذہنی معراج یہ تھی کہ جس کسی کو جنت میں اپنی جگہ محفوظ کرانی ہو اُسے چاہیے کہ وہ ان جیسا بن جائے اور بس ﴿وَقَالُوا كُونُوا هُوداً أَوْ نَصَارَى﴾ وہ کہتے تھے کہ یہودی اور عیسائی بن جاؤ۔ یہ حضرات جو خیر سے خود کو وقت کا مسلمان سمجھتے تھے باہم ایک دوسرے کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اہل یہود کے پاس ہے ہی کیا اور یہودی کہتے تھے کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ قرآن نے ان فرقہ بندیوں کو یکسر گمراہی قرار دیا۔ محمد رسول اللہ نے فرقہ پرستی کے عذاب میں مبتلا انبیاء سابقین کی قوموں کو یہ حیات افزاء آفاقی پیغام دیا کہ لوگو! عیسائی یا یہودی بننے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ ربّانی بنو ﴿کُونُوا رَبَّانِينَ﴾۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو ﴿وَمِنْ أَحْسَنِ مَنِ اللَّهُ صَبْغَةً﴾۔

قرآن کی ابتدائی سورتیں مختلف اسلوب سے وقت کے مسلمانوں (یہود و نصاریٰ) یعنی انبیاء

سابقین کی اُمتوں کو فرقہ بندی کے عذاب سے نکلنے کی دعوت دیتی ہیں ﴿وَمَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ (آل عمران: ۶۷) رسول اللہ کی دعوتِ توحید وقت کے مسلمانوں کو یہ بتا رہی تھی کہ توحید خالص کے علمبردار فرقہ بندی میں مبتلا نہیں رہ سکتے۔ خواہ یہ فرقہ بندی انبیائی حوالے سے ہی کیوں نہ وجود میں آئی ہو خدا کو مطلوب عیسائی یا یہودی بنانا نہیں بلکہ ربانی بنانا ہے۔

جو کتاب کسی رسول کے نام پر بھی گروہ بندی کی اجازت نہ دیتی ہو وہ اس بات کی اجازت کیسے دے سکتی ہے کہ اس کے ماننے والے غیر نبیوں کے نام پر مختلف فرقے وجود میں لے آئیں۔ ﴿کُونُوا رِءَاسًا﴾ کی قرآنی دعوت انقلاب آج ہم سے پوچھتی ہے کہ آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ محمد رسول اللہ کے ماننے والوں نے اپنی تاریخ کے ایک مرحلے میں حنفی شافعی، شیعہ سنی، بریلوی دیوبندی اور سلفی جیسی جماعتی شناختوں کو قبول کر لیا۔ آخر یہ کیسے ممکن ہوا کہ کبھی توحید خالص کے علمبردار دین کے حوالے سے بدترین قسم کی فرقہ پرستی میں مبتلا ہو گئے اور انھیں رفتہ رفتہ یہ سب کچھ معمول کی زندگی لگنے لگی۔ cult-worship میں مبتلا مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو، جس میں بدقسمتی سے آج جمہور اُمت گرفتار ہے، قرآن کی یہ صریح آیت کیوں نظر نہیں آتی کہ جن لوگوں نے دین میں فرقہ بندی کی، گروہوں میں بٹ گئے، ان کا کوئی تعلق اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں رہ گیا ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیْعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ﴾ (الأنعام: ۱۵۹)۔



شرک کا یہ قالب کہ وہ مذہب کے حوالے سے اہل مذہب کے دل و دماغ پر اپنے ڈیرے جمائے انسانی تاریخ میں نیا عمل نہیں ہے۔ درختوں کی پرستش اور سورج، چاند کی پوجا ایک ایسا کھلا شرک ہے جسے عام نگاہیں بھی دیکھ لیتی ہیں۔ البتہ دین کے نام پر فرقہ بندی یا کسی خاص تعبیر دین کو دین قرار دینا اور اس کی پرستش میں مبتلا ہو جانا ایک ایسا عمل ہے جس کی سنگینی کا اندازہ ہر خاص و عام کو نہیں ہوتا۔



آج اگر قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کو سرنگ کی دوسری طرف روشنی دکھائی نہیں دیتی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان وحی کی عظمت کے مقابلے میں علماء و فقہاء کی عظمت کہیں زیادہ مستحکم ہو گئی ہے۔ ہم قرآن مجید کے راست مطالعے اور اس سے اپنا چراغ فکر روشن کرنے کے بجائے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارے اس خیال کی تائید علمائے قدیم کے اقوال سے ہوتی ہے یا نہیں۔

مسلم فکر میں انقلاب کی ضرورت

مسلمان اس وقت جس بحران عظیم سے دوچار ہیں اس کی شدت کا اندازہ کچھ اس سوال سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر خاص و عام کسی نہ کسی لب و لہجہ میں اس خلجان کا اظہار کر رہا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود ہمیں من حیث الائمہ سرنگ کی دوسری طرف کوئی واضح روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ جس امت پر سیادت عالم کا فریضہ عائد کیا گیا ہے وہ قرآن مجید کی موجودگی اور علماء و مفسرین کے سلسلہ درس و ارشاد کے باوجود سخت نظری بحران میں کیوں مبتلا ہے۔ Auschwitz میں اہل یہود پر جو گزری اس کے بعد ان کے یہاں بھی اس سوال نے شدت سے سراٹھایا تھا کہ خدا اپنی برگزیدہ قوم کو آخر کس طرح بے یار و مددگار چھوڑ سکتا ہے۔ یہودی علماء اور دانشور اپنے آپ سے پوچھا کئے کہ اگر دنیا سے قوم یہود کا اسی طرح صفایا ہو گیا تو تاریخ کی معنویت کیا رہ جائے گی؟ اہل یہود جو عرصہ ہائے دراز سے تاریخ میں جینے کے خوگر ہیں وہ اب تک اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ دنیا کی سیادت سے ان کی معزولی عمل میں آگئی ہے۔ اہل یہود اور مسلمانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کی معزولی الہی فیصلہ ہے جبکہ امت مسلمہ کا زوال تاریخ کا ایک ایسا انحراف ہے جس کی درستگی کی ترکیب آخری وحی کی روشنی میں عین ممکن ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ صورت حال کا صحیح تجزیہ کرنے اور وحی ربانی کی روشنی میں اپنی گم کردہ راہوں کو منور کرنے کے بجائے مسلمان وحی کے بجائے تاریخی اسلام کے اسیر ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے انہیں اپنے زوال اور تاریخ کے انحراف کا صحیح اندازہ لگانے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے۔

دنیا اس وقت اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے دوچار ہے۔ Development کے نام پر غیر منصوبہ بند طریقے سے مختلف ملکوں میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جس طرح مختلف تنگ نظر مفاد پرست گروہوں

نے دنیا کو اپنی مٹھی میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، اس کے نتیجے میں اس وقت عالمی سطح پر انسانیت ایک غیر یقینی مستقبل سے دوچار ہے۔ ماحولیات کی تباہی، دنیا کی دولتوں کا چند ہاتھوں میں ارتکاز، بین الاقوامی کمپنیوں کی اجارہ داری، ذرائع ابلاغ کے ذریعہ فکر و نظر کی آزادی کا چھن جانا اور انسانوں کو وہی کچھ دیکھنے اور سننے پر مجبور کرنا جو دنیا کی چند بڑی قوتیں یا با اثر ٹولہ چاہتا ہے، یہ سب کچھ ایک ایسی صورت حال ہے جس سے نکلنے کی کوئی سمیل نظر نہیں آتی۔ خدا بیزار پالیسی ساز ذہن نے پوری دنیا کو ایک ایسی بھٹی میں تبدیل کر دیا ہے۔ انسانوں کی فکری اور مادی توانائی زندگی کے بجائے موت کی تیاری میں صرف ہو رہی ہے۔ ایسی صورت حال میں توقع تھی آخری وحی کے علمبردار انسانیت کے بے سمت قافلے کی رہنمائی کے لیے سامنے آئیں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خیر امت کے تمام تر دعووں کے باوجود امت مسلمہ خود اپنے وجود کی لڑائی میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی موجودہ بے سمتی تمام ہی خدا ترس نفوس سے رہنمائی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ البتہ اگر مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح اس چیلنج کو قبول کرنے کا یارا نہیں رکھتے تو پھر آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے ان کا وجہ امتیاز کیا رہ جاتا ہے؟

گذشتہ دنوں مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ میں شرکت کی غرض سے مجھے اسپین جانے اور وہاں مونٹ سرائٹ کی چوٹی پر ایک عیسائی خانقاہ میں قیام کا موقع ملا۔ اسی خانقاہ میں چند سکھ رہنما اور منی پور کے ایک پنڈت جی بھی قیام فرماتھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ صبح اندھیرے منہ اٹھ کر خاصی دیر تک محترم پنڈت جی کسی سفید رنگ سے بصد احتیاط اپنی پیشانی کو ناک تک مزین کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے چہرے بشرے سے مذہبی رہنما ہونا واضح ہو گیا۔ دوسری طرف ایک سکھ بزرگ ایک طویل کپڑے کو ٹھیک کرنے میں اپنے احباب کی مدد لے رہے تھے تاکہ وہ مذاہب کے عالمی اجتماع میں بانداز سکھ اپنی نئی پگڑی کے ساتھ شرکت کر سکیں۔ اس عالمی اجتماع میں طرح طرح کے مذہبی لباس اپنی جاہ و شکوہ کا اظہار کر رہے تھے۔ عیسائی راہبوں کا مخصوص لباس، اہل یہود کی مخصوص ٹوپی، برہماکار یوں کی سفید ساڑیاں اور بعض مسلم علماء کا ملبوس ریگستانی۔ کسی نے اپنے نام کے آگے ہرہولی نیس His Holiness لکھ رکھا تھا تو کسی کو Reverend یا فادر کے لاحقے پر اصرار تھا، کوئی ربائی تھا تو کوئی مولانا، اور کسی نے بے صدا احتیاط اپنے نام سے پہلے امام لکھنا مناسب سمجھا تھا۔

خدا شناسوں کے اس اجتماع میں لباس کی غیر معمولی تزئین اور احتیاط پر سخت حیرت بلکہ کوفت ہوئی۔ میں نے اپنے ہمسایہ پنڈت جی سے پوچھا اہل مذاہب کے اس عالمی اجتماع میں ہر ایک کو اپنے

مخصوص لباس پر اتنا اصرار کیوں ہے؟ بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد وہ دل کی بات بلا تکلف زبان پر لے آئے۔ کہنے لگے دراصل لوگ رشد و ہدایت کے لیے ہماری طرف دیکھتے ہیں۔ وہ ہمیں عام انسانوں سے الگ رول ماڈل کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہر کی یہ تمام آرائش دراصل ان کے اسی مطالبے کے پیش نظر ہے۔ ورنہ حقیقی بندگی سے بھلا لباس کا کیا تعلق۔ رسوماتِ بیجا کے اس اہتمام میں صرف پنڈت جی کو ہی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ تقریباً تمام ہی مذاہب کے رہنماؤں نے عوام الناس سے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لیے ایسے لباس کو اختیار کر رکھا ہے جس سے ان کا مذہبی یا خدا شناس ہونے کا فی الفور اور بہ نظر اول پتہ چل سکے۔ عام انسانوں کے لیے یہ ادراک کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس بھاری بھر کم لباس تقویٰ میں گوشت پوست کا کوئی عام انسان سانس لے رہا ہے جس کی فہم و بصیرت پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی جاسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب رومی افران حضرت مسیحؑ کی گرفتاری کے لئے آئے تھے تو ان کے لئے حواریوں کی مجلس میں حضرت مسیحؑ کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ انہیں جوڈا کے بوسہ تعظیم کا سہارا لینا پڑا تھا۔ حضرت مسیحؑ تو پھر بھی ایک برگزیدہ نبی تھے خود محمد رسول اللہ کے متبعین کا یہ حال تھا کہ انہوں نے کبھی بھی اپنے لئے کسی مصنوعی اور ظاہری وجہ امتیاز کو گوارا نہیں کیا۔ مدینہ کی گلیوں میں باہر سے آنے والے غیر ملکی وفد و خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کی بابت پوچھا کرتے اور انہیں یہ جان کر سخت حیرت ہوتی کہ ہٹوبچو سے دور معمولی سے لباس میں خلیفہ وقت ان سے مخاطب ہے۔ پہلی نسل کے مسلمان حریت فکر کی لذت سے آشنا تھے۔ وہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ خدا کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری یا رشد و ہدایت کا منصب کسی کو عام انسانوں کی سطح سے اٹھا کر تقدس کے منصب پر فائز نہیں کرتا۔ عام مسلمان اپنے قائدین اور اہل علم پر تنقیدی نگاہ ڈالنا اپنا حق سمجھتے۔ حتیٰ کہ عین خطبہ کے دوران ایک اعرابی عورت خلیفہ وقت کو ٹوک دینا اپنا حق سمجھتی۔ دوسری طرف قائدین اور اہل علم بھی اپنے آپ کو گوشت پوست کا عام انسان سمجھتے اور اپنے لئے کسی مافوق الفطری القاب کو گوارہ نہیں کرتے اور نہ ہی عام مسلمان اس خیال کے قائل ہوا کرتے کہ وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھ سکیں۔ مسلمانوں میں حریت فکر کی روایت جب تک باقی رہی ان کی نگاہیں اصحاب علم و فن سے ماوراء، وحی کے اوراق میں ہدایت کی طالب رہیں۔ البتہ جب سے اصحاب علم و فن نے اپنے آپ کو عام انسانوں سے الگ ایک مقدس مخلوق کی حیثیت سے پیش کرنے کی طرح ڈالی اور ان کے ناموں کے آگے پیچھے تقدس مآب القاب و آداب کی طویل قطار

وجود میں آنے لگی مسلم ذہن پر تقلید کی دھند بیز ہوتی گئی۔

آج اگر قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کو سرنگ کی دوسری طرف روشنی دکھائی نہیں دیتی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے درمیان وحی کی عظمت کے مقابلے میں علماء و فقہاء کی عظمت کہیں زیادہ مستحکم ہو گئی ہے۔ ہم قرآن مجید کے راست مطالعے اور اس سے اپنا چراغ فکر روشن کرنے کے بجائے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہمارے اس خیال کی تائید علمائے قدیم کے اقوال سے ہوتی ہے یا نہیں۔ جن لوگوں کو قرآن کا طالب علم ہونا چاہئے تھا انہوں نے القاب و آداب کے سہارے مخصوص مذہبی لباس کے جاہ و حشم میں خود کو religious authority باور کرا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمارے یہاں احبار و رہبان کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ آخر اس حیرت انگیز مماثلت کا سبب کیا ہے کہ جس طرح اہل یہود کے علماء خود کو ربائی کہلواتے اور خود کو خدا صفتی کا حامل سمجھتے ہیں اور جس طرح عیسائی علماء نے اپنے لئے Father یا آسمانی باپ کی اصطلاح اختیار کر رکھی ہے جو صرف خدائے واحد کو زیب دیتا ہے اسی طرح مسلم علماء نے بھی اپنے لئے مولانا کا لقب اختیار کر رکھا ہے جو خود قرآن مجید میں خدائے وحدہ لا شریک کے لئے استعمال ہونے والی اصطلاح ہے۔ جب تو میں اپنے اہل علم کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہیں اور جب عام انسانوں کے ذہن پر یہ بات نقش ہو جاتی ہے کہ خود ان کے درمیان بعض لوگوں کا انداز فکر تقدس سے عبارت ہے جس پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی جاسکتی تو حریت فکری کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ ایسی تو میں بحران کے لمحات میں مسائل کا نیا حل ڈھونڈنے اور وحی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو از سر نو منور کرنے کا حوصلہ کھودیتی ہیں۔ پھر مذہب کے نام پر ہونے والا سارا کاروبار دراصل مذہب کی نفی کرتا رہتا ہے۔ بائبل میں علمائے یہود اور فریسیوں پر حضرت مسیح کی سخت تنقید اسی خیال کی تائید کرتی ہے۔ خود قرآن مجید میں رسول اللہ کی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنا کہ آپ لوگوں کی گردنوں کو اصر و اغلال سے نجات دلاتے ہیں دراصل اسی خیال کو ذہن نشین کرانا ہے کہ خدانے اپنے دین کی تشریح و تعبیر کا حق کسی طبقہ مخصوص کو نہیں دے رکھا ہے اور یہ کہ محمد رسول اللہ کی دعوت انقلاب کسی ربانیت، پاپائیت یا مولویت کے ادارے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ سچی مذہبیت اور خدا ترسی اس بات کی کیسے اجازت دے سکتی ہے کہ اہل تقویٰ اپنے لئے شریک القاب و آداب کا استعمال روا رکھیں اور جھوٹے تقدس کی یہ غیر صحت مندر روایت حریت فکر و نظر کا چراغ گل کر دے۔



خدا کے نزدیک اہل یہود ہوں یا ہم مسلمان ہماری فوقیت کا بنیادی سبب تمسک بالکتاب تھا۔ اہل یہود جب تک تورات کو تھامے رہے، تمام اقوامِ عالم پر ان کی فضیلت قائم رہی۔ لیکن جب انہوں نے تورات کے گرد احبار و رہبان کی خود ساختہ تاویلات کے پہرے بٹھا دیئے اور جب ان کی مذہبی زندگی میں وحی تورات کے بجائے احبار و رہبان کی فقہ، مشنات و گمارا کے مجموعوں اور ملفوظات و طائف پر مشتمل کتابوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی گئی تو ان کا تعلق وحی ربانی سے ٹوٹ گیا۔



ماضی میں مصلحین اسلام کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بعض امور کو تحقیق و تجزیے سے بالاتر قرار دے رکھا تھا جس پر کسی گفتگو کا دروازہ کھولنا ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اتحاد امت کے تمام علمبردار اپنے اپنے فقہی دائرہ کار کے اندر ہی فکری و عملی سرگرمیوں کو روا سمجھتے تھے۔ ائمہ فقہاء اور ائمہ محدثین کی عقل و دانش اور ان کے علمی کاموں کو منزل من اللہ کا درجہ حاصل تھا۔

دنیا بھر کے اہل ایمان سوالی ہیں آخر کب آئے گی خدا کی مدد؟

مسلمان جو منصب سیادت سے اپنی معزولی کے باوجود اب بھی خود کو خیر امت سمجھتے ہیں، اپنے بارے میں طرح طرح کی خطرناک خوش گمانیوں میں مبتلا ہیں۔ صدیوں سے جو قوم اپنے اقوال و اعمال سے شب و روز اس بات اعلان کر رہی کہ ے

رہ گئی رسم اذال روح بلالی نہ رہی

جذبانی طور پر اب تک وہ اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ نہیں کہ جس امت پر مشکل گھڑی میں آسمان سے فرشتوں کے نزول کا وعدہ ہے بد قسمتی سے موجودہ مسلمان اب وہ امت نہیں رہے۔ خوب صورت نعتوں کی دلکش آوازوں، سیرت کے جلسہ و جلوس، عبادات کے اجتماعی مظاہرے خواہ ہمیں ہمارے اہل ایمان بنے رہنے پر کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائیں، واقعہ یہ ہے کہ ہم اب وہ کچھ نہیں رہے جنہیں ﴿محمد رسول اللہ والذین معہ﴾ کی جماعت کا نام دیا جاسکے۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ صدیاں گزریں جب کبھی ہم سیادت عالم کے منصب پر فائز تھے، ہمارا ملی وجود خیر امت سے عبارت تھا، آخری نبی کی امت کی حیثیت سے تاریخ کے آخری لمحے تک دنیا کی سیادت ہمارے نام لکھ دی گئی تھی۔ سیادت کا یہ منصب ہمیں وحی محمدی کی وجہ سے عطا ہوا تھا۔

وحی کی تجلی جب تک ہماری راہوں کو منور کرتی رہی ہم تاریخ کی لگام سنبھالے رہے۔ دنیا میں واقعات کا رخ ہماری مرضی سے متعین ہوتا تھا اور جب کبھی دشوار لحاظات میں ہمیں واقعات پر اپنی گرفت ڈھیلی محسوس ہوتی تو بے ساختہ ہماری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ ہم خدائے قادر مطلق سے اضافی مدد

کے طالب ہوتے اور عین پریشان کن لحاظ میں حیرت انگیز طور پر اپنے خدا کی نصرت کو موجود پاتے۔ بدر کے معرکے میں تو خود ذات ختمی رسالت موجود تھی جس نے مٹھی بھر اہل ایمان کی نصرت کے لئے رب ذوالجلال کی نصرت چاہی تھی لیکن اہل ایمان کے بعد کے معرکے بھی خواہ وہ ایران و روما کی سلطنتوں کا سرنگوں ہونا ہو یا بعد کے عہد میں اسپین کے ساحل پر کشتیاں جلانے کا واقعہ، ان تمام لحاظ میں مسلمانوں کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ ایک زندہ اور متحرک خدا ان کی نصرت کیلئے ہمہ وقت موجود ہے، جس کے بل بوتے پر وہ بڑی سے بڑی مہم جوئی کا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ معروف ایرانی فوجی جرنیل ہرمزان جب گرفتار ہو کر حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تھا تو اس نے اسی بات کی شہادت دی تھی۔ اس نے کہا اے عمر! جب تک قوت کا قوت سے مقابلہ تھا تم ہمارے مقابلے میں کسی شارو قطار میں نہ تھے لیکن آج خدا تمہاری طرف ہے اور خدا جس کی طرف ہو اس پر کون غالب آسکتا ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جو کل خدا کی نصرت کے بھروسے سے بڑی سے بڑی معرکہ آرائی سر کیا کرتے تھے۔ لیکن اب آخر کیا بات ہے، صدیاں گزریں ہم نصرت خداوندی کی اس لذت سے نا آشنا ہیں۔ دین کے لئے مرنے مٹنے والوں کی آج بھی کمی نہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں حزب اللہ، جند اللہ، اسلامی جہاد، جماعت اسلامی، مجاہدین اسلام، سپاہ صحابہ، فوج محمدی اور نہ جانے کن کن ناموں سے اسلام کے لئے جان دینے والے موجود ہیں۔ دنیا کا کون سا خطہ ہے جہاں محمدؐ کے نام لیواؤں نے اپنے خون سے عزیمت کی داستان نہ لکھی ہو۔ لیکن اب ہر چھوٹے بڑے معرکہ میں صاف محسوس ہوتا ہے جیسے شکست ہمارا مقدر بن گئی ہو۔ خدا جو آج بھی قادر مطلق ہے اور جو چشم زدن میں حالات کا رخ پھیر سکتا ہے مسلمانوں کی مدد کو نہیں آتا۔ حالانکہ گریہ وزاری کی مٹلئیں سب سے زیادہ اسی قوم مسلم کے درمیان سجائی جاتی ہیں، نالے سب سے زیادہ یہیں بلند ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہو جب صدیوں سے یہ امت آگ و خون کے سمندر میں غوطے لگا رہی ہو، جب اس پر لمحہ لمحہ عذاب کر دیا گیا ہو اور جب ہر سوا ایک قیامت انگیز کھرام پبا ہو۔ محشر کی اس گھڑی میں آخر پکارنے والے کسے پکاریں؟ مسجدیں اب پہلے سے کہیں زیادہ آباد ہیں۔ اصلاحی اور تبلیغی تحریکوں نے نماز و روزے، شب بیداری اور مراقبہ کا وافر ماحول تیار کر دیا ہے۔ سنن و نوافل پڑھنے والوں اور شب و روز اور ادو و طائف پڑھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ امت کے اس عمومی اضطراب اور بے بسی کے باوجود خدائے واحد کی توجہ ہماری طرف نہیں ہوتی؟

یہ وہ سوال ہے جس نے ہر خاص و عام کو مضطرب کر رکھا ہے۔ بڑے بڑے ذہنوں پر کنفیوژن کی

آندھیاں چل رہی ہیں۔ چند سال پہلے افغانستان پر امریکی حملے کے دوران جب افغانیوں نے غیرت کا سودا کرنے سے انکار کر دیا اور جس کے نتیجے میں انہیں امریکی افواج کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا، آسمان سے B-52 طیارے موت برسائے لگے، ان چند ہفتوں میں شاید ہی کوئی گزرا مسلمان بھی ہو جس نے رو رو کر بارگاہِ خداوندی میں دعائیں نہ مانگی ہوں۔ کیا مشرق کیا مغرب، کیا شیعہ کیا سنی، پوری مسلم دنیا بیک آواز چیخ اٹھی: بارالہا! اس مجبور و بے بس امت کی خبر گیری کر۔ مسجدیں قنوت نازلہ کی آہ و بکا سے گونج اٹھیں۔ حتیٰ کہ ان مسلمانوں نے بھی جنہوں نے کبھی مسجد کا رخ نہیں کیا تھا، اپنی پیشانیوں سے سجدہ گاہوں کو آباد کر ڈالا۔ افغانیوں نے کمال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ آسمان سے برستی مسلسل موت بھی ان کے پایہ استقامت کو نہ ڈگمگا سکی۔ تب پوری دنیا کو ایسا لگتا تھا گویا کوئی معجزہ ہونے کو ہے۔ ایام ہفتوں میں بدلتے گئے، کوئی معجزہ تو کیا ہوتا، ہاں مسلمانوں کی شکست نمایاں ہونے لگی۔ افغانستان میں جو کچھ ہوا اس نے اہل ایمان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ خداوند وہاں بھی مسلمانوں کی مدد کو نہیں آیا۔ امت ایک گہری مایوسی میں ڈوب گئی۔ ۱۲۵۸ء میں سقوط بغداد کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ دوسرا واقعہ تھا جب ان کا جذباتی وجود کاملاً ڈھ کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اب کوئی نئی صبح اس امت کی زندگی میں کبھی نہ آئے گی۔

ہم من حیث القوم تاریخ کے ہر نازک لمحے میں ﴿نصر من اللہ وفتح قریب﴾ کا علم بلند کرتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنی بساط بھر حالات کا مقابلہ کرنے اور اسے بدل ڈالنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن نصرت الہی کی لذت سے ہمارے حواس نا آشنا رہے۔ پچھلے دنوں عراق میں امریکی ٹینکوں کی پیش قدمی کے دوران جب تیز ریگستانی آندھی اٹھنے لگی تھی تو ہم مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا لگا گویا اب خدا کی مدد آپہنچی ہے مگر جلد ہی خوش فہمیوں کے ان غباروں سے بھی ہوا نکل گئی۔ سقوط بغداد نے ایک بار پھر اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھا دیا کہ خدا اب ہماری طرف نہیں ہے اور جب تک کسی امت کو تائیدِ غیبی حاصل نہ ہو، خدا کی پشت پناہی کے بغیر شکست اس کا مقدر ہے، صدیاں گزریں ہم ہر روز ایک نئے سقوط سے دوچار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے ہر لمحہ ہمارے اندرون میں کچھ ڈھ رہا ہے۔ ہمارا مجموعی وجود اس صورتِ حال پر سخت مضطرب ہے۔ آخر کب آئے گی خدا کی مدد؟

ہمارے فقہاء و مفسرین اس سوال کا صحیح تجزیہ کرنے اور اس کا مدلل جواب فراہم کرنے کے بجائے قرآنی آیات کی غلط تاویل کے ذریعے ہمیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بقول یہ ساری مصیبتیں دراصل اہل ایمان کی حیثیت سے ہماری آزمائش ہیں ﴿وہم حسبکم ان تدخلوا الجنة ولما

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خَلُّوا مِنْ قِبَلِكُمْ مَسْتَهْمِ الْبِأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَزَلُّوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ
ءَامَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾ (البقرة: ۲۱۴) کا مطلب انہوں نے یہی سمجھا ہے کہ
دنیا تو ہے ہی مسلمانوں کے لئے مصائب و آلام کی جگہ۔ یہاں کافروں کی چاندنی ہے۔ مسلمانوں کیلئے
چونکہ آخرت کی ضمانت ہے اس لئے انہیں دنیا میں ان دل گرفتہ حالات پر صبر و سکون سے کام لینا چاہیے۔
بعض گروہوں نے صورت حال کی شدت سے تنگ آ کر ترک دنیا کو باقاعدہ مذہبی رویے کی حیثیت دے
رکھی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے ترک دنیا ممکن نہیں۔ جہاں شب و روز ہمارا وجود
انہدام کا شکار ہو، ہم میں سے کتنے لوگ غور و فکر سے منہ موڑ کر شتر گری اختیار کر سکتے ہیں اور کب تک؟ پھر
قصہ یہ ہے کہ ذلت کی یہ زندگی اور پے در پے شکستوں کا یہ عذاب ہماری اس تاریخ سے میل نہیں کھاتا جس
میں مسلمانوں کی وہ نسل رہتی تھی جس کی مسلمانیت اور اطاعت گزاری پر ہم آج بھی عیش کرتے ہیں اور
جنہیں ہم اپنی زندگی میں رول ماڈل کے طور پر برتنے کے متمنی ہیں۔ بھلا محمد رسول اللہ اور ان کے اصحاب
سے بڑا مسلمان اور کون ہوگا۔ ان پر نازک لمحات ضرور آئے لیکن ذلت کی زندگی اور شکستوں کے عذاب
مسلل سے انہیں واسطہ نہ پڑا۔ ہماری تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اہل ایمان کے لئے دنیا میں بھی
سرفرازی کا وعدہ ہے اور آخرت تو ان کے لئے ہے ہی محفوظ۔ قرآن کے صفحات اسی بات پر گواہ ہیں کہ
تاریخ کے ہر دور میں اہل ایمان کو آخرت کی بشارت کے ساتھ ساتھ دنیا کی سیادت بھی عطا کی گئی۔ داؤد و
سلیمان کی پر شکوہ سلطنت کے تذکرے اور بنی اسرائیل کو تمام عالم پر فضیلت عطا کرنے کی باتیں ہمیں یہی
تو بتاتی ہیں کہ ہم خدا کی پارٹی میں آگئے تو دنیا ہماری مٹھی میں آجاتی ہے کہ ایسا پہلے بھی ہوا ہے اور اسی کی
بشارت قرآن مجید میں موجود ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ صدیاں گزریں، ہر مشکل مرحلے میں ”الا ان نصر
اللہ قریب“ کی بشارت کسی فیصلہ کن مرحلے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے اور ہماری جدوجہد نصرت الہی سے
محروم ایک نئی داستانِ عبرت پر ختم ہو جاتی ہے۔ واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ خدا جس قوم کی مدد کو آئے،
جس کا رفیق و معاون بن جائے وہ اب ہم نہیں۔

زوال کی صدیوں میں ہمارے ہاں ایک اہل فکر شاعر پیدا ہوا جس نے خدا کے دستِ شفقت
اٹھائے لینے پر شکایات کا انبار لگا دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس شوخ و شنگ شاعر کی شکایت حقیقت واقعہ تھی۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

البتہ اس صورت حال کے مداوا کیلئے شاعر نے جو جواب تلاش کیا وہ اتنا ہی روایتی تھا جسے مختلف قالب میں ہمارے علماء سابقین پیش کرتے آئے ہیں۔ صبح کی بیداری، خدا کی دلداری، اس تک پلٹنے کی باتیں فی نفسہ ان جوابات کی صحت پر کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ البتہ ان صحیح جوابوں کی موجودگی کے باوجود اگر ہمارا ملی قافلہ نصرت الہی کے حصول میں ناکام رہا تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم رجوع الی اللہ کو عرصے سے بعض رسوم عبادات میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لئے رجوع الی اللہ کی ہماری تمام تر کوشش بھی ہمیں خدا کی مدد کا مستحق نہیں بناتی۔ نصرت کا قرآنی وعدہ ہم سے بہت دور رہ جاتا ہے۔ پھر فطری طور پر مضطرب دل و دماغ میں یہ اندیشے جنم لیتے ہیں آیا خدا ہے بھی یا نہیں؟ کہاں ہے وہ خدا جس نے مؤمنوں کی مدد کا وعدہ کر رکھا ہے۔

جب واقعات مسلسل اس بات کی شہادت دے رہے ہوں کہ خدا نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو ہم نصرت الہی کے بھروسے جینے والے لوگوں کے لئے لازم ہے کہ اس سوال کا فی الفور جواب فراہم کریں اولاً ایسا کیوں ہوا اور ثانیاً یہ کہ دوبارہ نصرت خداوندی کا سزاوار بننے کیلئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ گویا من حیث القوم ہمیں اپنے اجتماعی وجود کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم اپنے حال پر سوالیہ نشان نہیں لگاتے، مستقبل کیلئے راستہ ماننا ممکن نہیں۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ ہم خواہ محمد رسول اللہ سے اپنا کتنا ہی تعلق کیوں نہ بتائیں واقعہ یہ ہے کہ فکری اور عملی طور پر ہم اصحاب رسول کی جماعت سے بس واجبی نسبت رکھتے ہیں۔ وہ جس اسلام کے پیروکار تھے وہ کچھ اور تھا۔ ان کی جگہ گاتی زندگی قرآن مجید کے صفحات میں جھلکتی تھی۔ ہم نے اپنی مذہبی زندگی کی تعمیر میں قرآن کے بجائے بھانت بھانت کی خود ساختہ کتابوں کو اپنا معاون بنا رکھا ہے۔ وہ عبودیت کی لذت سے آشنا تھے، ہم رسوم عبودیت میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ وہ خیر امت تھے جن کی ہاتھوں میں تاریخ کی لگام تھمائی گئی تھی۔ ہم خیر امت کی خوش گمانیوں میں مبتلا عملی طور پر اس منصب سے معزول تاریخ کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارا حال اہل یہود سے کچھ مختلف نہیں جو اپنی معزولی کے باوجود آج بھی خود کو Chosen People سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جن کے ہاں دین داری نام ہے رسوم دین داری کا اور چونکہ خالی خولی رسوم وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو زندہ دین داری پیدا کر سکتی ہے، اسلئے مذہب کی طرف ہماری تمام تر واپسی کے باوجود مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہوتے۔ آج اس امت میں ارکان اسلام پر عامل شب بیدار مسلمانوں کی کمی نہیں۔ مابعد استعمار عہد میں مسجدیں کہیں زیادہ آباد ہیں۔

مدارس کی تعداد روز افزوں اضافے پر ہے۔ مسلمان نوجوانوں میں دین کی طرف واپسی دنیا بھر میں ایک محسوس عمل کی حیثیت سے واشگاف ہے۔ پھر بھی یہ رسومِ دین داری ہمیں نصرتِ خداوندی کا حقدار نہیں بناتی اور خدا ہماری مدد کو نہیں آتا تو یہ بات غور کرنے کی ہے کہ ہم جسے دین داری سمجھ بیٹھے ہیں یہ سب کچھ اللہ کو واقعی مطلوب ہے بھی یا نہیں۔

نصرتِ خداوندی کے غیاب میں ہماری آہ و بکا کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے اہل یہود کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایسا اس لئے بھی کہ قرآن مجید بار بار انحرافِ یہود کے حوالے سے ہمیں بے جاں رسومِ عبودیت سے متنبہ کرتا ہے۔ اہل یہود جنہیں ہم مسلمان مغضوب الغضب اور راندہ درگاہ قوم کی حیثیت سے جانتے ہیں، انکی مذہبیت کا یہ عالم ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں باریک سے باریک تفصیل بھی اپنے ربانیوں اور فقہاء سے معلوم کرنا لازم خیال کرتے ہیں۔ یومِ کافور کی تفصیلات ہوں یا آدابِ سبت، یا حلالِ ذبیحہ کا معاملہ، مذہبی یہودی جس باریک بینی کے ساتھ تلمودی رسوم کو انجام دینا ضروری سمجھتا ہے اسے دیکھ کر تو دوسروں کو بھی یہ لگتا ہے کہ اس سرزمین پر شاید ہی کوئی گروہ ایسا ہو جو اپنی زندگی میں مذہب پر اس قدر عامل ہو۔ اہل یہود آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی منتخب قوم ہیں جنہیں اللہ نے اقوامِ عالم پر فضیلت دی ہے چونکہ وہ حاملِ تورات ہیں اور یہ وہ منصب ہے جس کے حوالے سے وہ خدا کے چہیتے ہیں۔ پھر بھلا خدا ان کی خبر گیری نہ کرے تو کس کی کرے گا۔ نازی جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جب عمومی نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا اور خدا کے ان خود ساختہ چہیتوں پر جب خدا کی زمین تنگ ہونے لگی تو مذہبی یہودی دانشور پکار اٹھے کہ آخر خدا اپنے چہیتوں کو اس طرح ختم ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہے۔ کسی نے کہا تورات کے الفاظ میں قوتوں کا پوشیدہ خزانہ موجود ہے۔ اگر مخصوص آیات کی مسلسل تلاوت کی جائے تو حالات بدل سکتے ہیں۔ کسی نے قبلائی نقوش کا سہارا لیا، کسی نے ربائی ادب سے اپنا تعلق جوڑا اور کسی نے اجتماعی ذکر و مراقبے کی مجلسیں آباد کر ڈالیں۔ جوں جوں جرمنی اور اس سے متعلقہ علاقوں میں اہل یہود پر زمین تنگ ہوتی گئی، ان کی مذہبی زندگی کا احیاء نمایاں ہونے لگا۔ حتیٰ کہ عقوبت گاہوں اور (concentration camps) میں یہ منظر دیکھنے کو ملا کہ کوئی کھڑے کھڑے کسی ذکر میں مشغول ہے تو کوئی زیر لب کسی ورد میں مصروف۔ حتیٰ کہ ان کیمپوں میں جہاں کھانے کیلئے روٹی کے چند نوالے اور جسم پر ڈھنگ کا لباس نہ رہ گیا تھا، وہاں بھی یہودیوں نے محافظوں کو رشوت دے کر اگر کچھ حاصل کرنا ضروری سمجھا تو وہ دعاؤں کی کتابیں Siddur تھیں جن پر وہ اجتماعی اور انفرادی طور پر عمل پیرا تھے۔ یہ مذہبی کتابیں جب تلاشی کے دوران ضبط

کر لی جاتیں اور انہیں یہودیوں کی نگاہوں کے سامنے نذر آتش کر دیا جاتا تو مذہبی یہودی پکاراٹھتے کہ کیا ان وظائف کی کتابوں کے بغیر دنیا باقی رہ سکے گی؟ بعض یہودی زاہد، یہ سمجھتے تھے کہ اگر تورات کے بعض حصوں کو استغراق کے ساتھ مسلسل پڑھا جائے اور پھر خدا سے نصرت کی طلب کی جائے تو اس کی مدد کا آنا یقینی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عقوبت گاہ میں بالآخر ایک ایسے زاہد کو ایک خندق میں، جہاں مردے پھینک دیے جاتے تھے، ایک گوشہ عافیت مل گیا۔ وہ مسلسل وہاں اوراد و وظائف میں مشغول رہا۔ یہاں تک کہ اس خندق کا نام لوگوں نے بیت مدراش رکھ دیا۔ لیکن ان مسلسل دعاؤں اور سخت مجاہدے کے باوجود خدا ان کی مدد کو نہ آیا۔

رسوم عبودیت کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ اہل یہود نے ان سخت حالات میں بھی مذہبی زندگی کے ارکان پر عامل رہنے کی بھرپور کوشش کی۔ کہیں سے ایک ٹفلن کا جوڑا مل جاتا یا نمازی شال (tillet) ہاتھ لگ جاتی تو ان کی مایوس زندگی میں مسرت کی ایک لہڑ دوڑ جاتی۔ باری باری سے وہ ٹفلن لگا کر عبادت کرتے۔ حتیٰ کہ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک پیدل مارچ میں بھی وہ اس بات کا اہتمام کرتے کہ ان میں کوئی تلمود کا عالم ہو تو وہ فقہ یہود کا درس جاری رکھے۔ عقوبت گاہوں میں جب بھی محافظوں کی آمد و رفت کم ہوتی، یہودی اجتماعی طور پر ان لوگوں سے تورات و مثنیات کا زبانی درس سنتے، جو اپنے حافظے میں ان مذہبی کتب کو محفوظ رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ Maidanek کے کیمپ میں جہاں تین ہزار یہودی رکھے گئے تھے، ان میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو روز اجتماعی عبادت میں شریک نہ ہوتے ہوں، کوڑے کے ایک ڈھیر پر جب ایک دن تلمود کا صفحہ کسی کو نظر آ گیا تو ان قیدیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسی کیمپ میں موجود ربائی اسحاق ذنبہ تلمود کے اس صفحہ کا باقاعدہ درس دیتے۔ گو کہ ان کیمپوں میں ان کی مذہبی کتابیں ضبط کر لی جاتی تھیں، لیکن ان کی مذہب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں نے مختلف چیزوں کو جن کا غذات میں لپیٹ رکھا تھا وہ تلمود کے صفحات ہی تھے جو لوگ کھانے کے چند نوالوں کے لئے مدت سے ترسائے گئے ہوں ان کی مذہب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی موقع ہاتھ آتا تو وہ محافظوں سے اپنے کھانے کے بدلے یا اپنے دانتوں میں لگے سونے کے بدلے تورات کا کوئی نسخہ، وظیفہ کی کوئی کتاب، Siddur کا کوئی ایڈیشن خرید لیتے۔ اتنی سخت مذہبیت کے باوجود ان کی چیخ و پکار رایگاں گئی۔ خدا کے یہ خود ساختہ چہیتے رسوم بندگی کے ان تمام مظاہروں کے باوجود اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جرمنی کی مختلف عقوبت گاہوں بالخصوص Auschwitz میں اہل یہود پر جو گزری اس سے پوری

قومِ یہود دہل گئی۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی دو تہائی یہودی آبادی نازیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ یہ سب کچھ چشمِ زدن میں نہیں ہو گیا۔ عقوبت گاہوں کی کہانیاں اور موت گاہوں کے لرزہ انگیز مناظر جب عام ہوتے گئے اور یورپ کے یہودیوں کو صاف محسوس ہونے لگا کہ ان کا من حیث القوم خاتمہ اب چند دنوں کی بات ہے۔ وہ مسلسل اپنے آپ سے پوچھا کئے، کیا خدا ہم چہیتوں سے اپنی دنیا خالی کر لے گا؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جو تورات کے حاملین ہیں، ہم جو لمحہ لمحہ تلمود پر عمل پیرا ہیں، ان کے وجود سے دنیا خالی ہوتی ہوئی نظر آئے اور پھر بھی خدا کی رحمت کو جوش نہ آئے۔ بعض دلوں میں یہ شکوک بھی جنم لیتے آیا خدا ہے بھی یا نہیں؟ بنو اسرائیل کی عظمت کا فسانہ جواب تک سنا کئے تھے، یہ سب خواب و خیال کی باتیں تو نہیں؟

سچ پوچھئے تو Auschwitz نے اہل یہود کی مذہبی فکر کو ایک بحران سے دوچار کر دیا۔ لیکن تب بھی مقدس ماضی میں جینے والی یہ قوم اپنی مذہبی زندگی کے احتساب پر آمادہ نہ ہوئی۔ یہ پہلا واقعہ نہیں تھا جب یہود کسی بڑے حادثے سے دوچار ہوئے ہوں، حضرت مسیح کی آمد کے بعد ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تباہی اور تب سے اب تک ان کی ملی زندگی ایک عذابِ مسلسل سے عبارت رہی ہے۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں ذلت کے عذاب میں مبتلا رہے۔ ابھی ان کے قدم جمنے بھی نہ پاتے کہ وہ ان علاقوں سے ذلت کا عذاب لیے نکلنے پر مجبور ہوتے۔ صاف محسوس ہوتا کہ جب خدا کسی قوم سے اپنا دستِ شفقت اٹھالے تو پھر اسے جہاں میں کہیں امان نہیں ملتی۔ ان کے اندر علماء و دانشور، اہل حرفت اور عقل و خرد رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ وہ زبردست محنت کے عادی تھے۔ دل و دماغ کی فطری صلاحیتوں میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ دنیا کمانے اور اس کے استعمال کا بھی انہیں خوب فن آتا تھا لیکن جب خدا ہی اپنا دستِ کرم اٹھالے تو یہ بہترین انسانی صلاحیتیں بھی کام نہیں آتیں۔ لیکن افسوس کہ ان کے ذہن ترین افراد بھی دیوار پر لکھی اس واضح تحریر کو پڑھنے میں ناکام رہے۔ خود کو داؤد سلیمان کی سلطنت کا وارث سمجھنے والے اہل یہود آج بھی اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں جن کے بغیر تاریخ کا سفر بے معنی ہے بلکہ معاصر تاریخ میں قیام اسرائیل کے بعد ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں خوابیدہ عربوں کے طفیل انہیں جو غیر معمولی کامیابی ملی اس سے وہ اس بات کی سند لاتے ہیں خدا دوبارہ ان کی پشت پر موجود ہے۔ حالانکہ ان کے خدا ترس علماء ہانکے پکارے یہ کہہ رہے ہیں کہ ریاست اسرائیل کا وجود تلمودی فقہ سے ہم آہنگ نہیں اور نہ ہی اس ریاست میں تورات کی تعلیمات کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔ جو ریاست دجل و فریب، ظلم و بربریت سے غذا

حاصل کرتی ہو، جہاں تورات کی تعلیمات ریاست کی مصلحتوں میں دفن کردی جاتی ہو، بھلا ایک ایسی غیر توراتی ریاست کی پشت پر خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ ماضی میں جینے والی قوم اپنے محاسبے پر آمادہ نہیں ہوتی، اس کی ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ صورت حال کی کوئی ایسی تاویل کر لے جو اسے خود احتسابی سے بچا سکے۔

کھلی آنکھوں اور بیدار دل و دماغ سے دیکھا جائے تو ہم مسلمانوں کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں۔ بد قسمتی سے ہم بھی تاویلات کے خوگر ہو چکے ہیں۔ ہم اپنی پے درپے ناکامیوں کا احتساب کرنے کے بجائے ایسی تاویلات سے دل بہلانا مناسب سمجھتے ہیں جس سے ہماری تکلیف دہ صورت حال پر پردہ پڑا رہ سکے۔

تاریخ کے اس نازک مرحلے میں اگر ہم بھی اہل یہود کی طرح اپنی خود ساختہ تاویلات پر مصر رہے تو ہمارا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہو سکتا کہ خدا کے نزدیک اہل یہود ہوں یا ہم مسلمان ہماری فوقیت کا بنیادی سبب تمسک بالکتاب تھا۔ اہل یہود جب تک تورات کو تھا مے رہے، چہار داگ عالم پران کی فضیلت قائم رہی۔ لیکن جب انہوں نے تورات کے گرد احبار و رہبان کی خود ساختہ تاویلات کے پہرے بٹھا دیئے اور جب ان کی مذہبی زندگی میں وحی تورات کے بجائے احبار و رہبان کی فقہ، مشنۃ و گمار کے مجموعوں اور ملفوظات و نظائف پر مشتمل کتابوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی گئی تو ان کا تعلق وحی ربانی سے ٹوٹ گیا۔ انسانی تشریح و تعبیر میں باقی ماندہ تورات کو انہوں نے جس طرح محصور کر دیا اس کے نتیجے میں عبودیت کا چراغ گل ہونا یقینی تھا۔ بندگی غائب ہو گئی۔ رسومِ بندگی ان کا سرمایہ قرار پایا۔ ان رسوم کی ادائیگی میں وہ اتنے پختہ ہوئے کہ انہوں نے معمولی باتوں پر فقہ کی ضخیم مجلدات مرتب کر ڈالیں۔ ربائی تاویلات نے اہل یہود کی مذہبی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ ان کے علماء و فقہاء یہاں تک کہنے لگے کہ خدا نے جب ایک بار تورات ہمارے حوالے کر دیا ہے تو اب اس کی تشریح و تعبیر کا کلی حق بھی ہمیں ہی حاصل ہے۔ موسیٰ کے مقابلے میں ربائی اکیوا تورات کے کہیں زیادہ مستند شارح سمجھے گئے۔ فقہاء کا تعمیر کردہ یہ دین آج بلا تکلف ربائی یہودیت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ دین موسوی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ باقی ماندہ تورات سے بھی اس کا رشتہ بس واجبی سا ہے۔ فقہائے یہود کا تعمیر کردہ یہ دین وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا جو دین موسوی کا خاصہ رہا ہے۔ دین فقہاء اور دین وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں وحی فرد کے دل و دماغ سے عبودیت کا ملہ کا آبشار بہانا چاہتی ہے وہیں فقہاء کی باریک بینی مظاہر پرستی کا ایک ایسا دفتر مرتب کرتی ہے جس پر

عبودیت کا صرف گمان ہوتا ہے۔ وحی تاریخ کا راز افشا کرتی اور اپنے حاملین کو تاریخ کی شاہ کلید عطا کر دیتی ہے۔ جب کہ فقہاء و ربائی اپنی احتیاط پسندی میں مطالب وحی کی ایک ایسی طویل فہرست ایجاد کر ڈالتے ہیں جن کی تفصیلات میں بسا اوقات خود غایت وحی دم توڑ دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ احبار و رہبان پر غیر ضروری انحصار پوری قوم کو وحی کی تجلی سے دور کر دیتی ہے اور مذہبی زندگی کی مشین انسانوں کی مرتب کردہ تعبیر و تشریح کی مرہون منت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اہل یہود پر جو گزری سو گزری۔ ان کے اس دردناک انجام میں ہمارے لئے بڑا سبق ہے۔ آنکھیں اگر کھلی ہوں تو اہل یہود سے متعلق عبرت ناک بیانات میں، جس سے قرآن کے صفحات پُر ہیں، ہم اس سوال کا جواب باسانی تلاش کر سکتے ہیں کہ ہم کیوں معزول ہوئے اور آخر کیوں خدا نے ہمارے اوپر سے اپنا دست شفقت اٹھالیا ہے۔



دینِ فقہاء اور دینِ وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں وحی فرد کے دل و دماغ سے عبودیت کا ملہ کا آبشار بہانا چاہتی ہے وہیں فقہاء کی باریک بینی مظاہر پرستی کا ایک ایسا دفتر مرتب کرتی ہے جس پر عبودیت کا صرف گمان ہوتا ہے۔ وحی تاریخ کا راز افشا کرتی اور اپنے حاملین کو تاریخ کی شاہِ کلید عطا کر دیتی ہے۔ جب کہ فقہاء و ربائی اپنی احتیاط پسندی میں مطالب وحی کی ایک ایسی طویل فہرست ایجاد کر ڈالتے ہیں جن کی تفصیلات میں بسا اوقات خود غایت وحی دم توڑ دیتا ہے۔



تقلید اور اصلاح ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور نہ ہی تقلید اور تنویر (Enlightenment) کا اجتماع ممکن ہے۔ دانش انسانی کے استعمال میں سابقین کے تجربات سے ہم کسب فیض تو ضرور کر سکتے ہیں البتہ اس بات پر اصرار نہیں کر سکتے کہ اس عمل میں ہمارے اور ان کے نتائج یکساں ہوں۔ اگر نتائج کی یکسانیت کو ہدف قرار دے دیا جائے تو غور و فکر کا سارا سلسلہ لایعنی قرار پاتا ہے۔

پیبرانہ لب و لہجہ کا غیاب

تاریخ کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ کی حیثیت کافۃ للناس بشیرا و نذیرا کی ہے۔ انسانی تاریخ کا یہ آخری رسول جب تک اس سرزمین پر موجود رہا، پوری نوع انسانی کو فلاح و کامرانی کی طرف بلاتا رہا۔ محمد رسول اللہ کی دعوت میں ایک بین الاقوامی اپیل تھی۔ تب اسلام کا مطلب ایک ایسی دعوت سمجھا جاتا تھا، جو انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرتی۔ بجھے دل اور شکستہ قلوب اسلام کی پناہ گاہ میں سکون و عافیت کا سامان پاتے۔ یہ اسی مسیحا نہ آواز کا اثر تھا کہ جزیرۃ العرب سے اٹھنے والی اس آواز نے غیر اقوام کی صالح روحوں کو بھی بہت جلد اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ صہیب رومی ہوں یا بلال حبشی، سلمان فارسی ہوں یا دیگر غیر عرب افراد، ان سبھوں کو اسلام کی دعوت میں نجات و رحمت کا اتنا ہی امکان دکھتا تھا جتنا کہ عرب ثقافت کے مقامی رہنماؤں مثلاً ابو بکر و عمر اپنے لئے اس نوید مسیحائی میں امکانات واپاتے تھے۔ یہ تھی وہ پیبرانہ آواز جو رسول اللہ کی زبان مبارک سے بلند ہوئی اور جس نے دیکھتے دیکھتے تمام اقوام عالم کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

آج گو کہ محمد رسول اللہ کے متبعین کی تعداد ۱.۶ بلین سے تجاوز کر گئی ہے۔ اسلام ایک عالمی مذہب کے طور پر جانا جاتا ہے لیکن افسوس کہ کسی گوشے سے وہ پیبرانہ آواز سنائی نہیں دیتی۔ دنیا اس نوید مسیحائی سے محروم ہے۔ مسلمانوں کے تمام ہی بین الاقوامی فورم خواہ وہ تنظیم اسلامی کانفرنس ہو یا رابطہ عالم اسلامی، عرب لیگ ہو یا عالم اسلام کی دوسری معتبر تنظیمیں ہر جگہ اگر کوئی بحث جاری ہے تو وہ اس بات پر کہ مسلمانوں کو موجودہ معاشی، سیاسی، اور تعلیمی پستی سے کیسے نجات دلائی جائے۔ اقوام عالم کے درمیان مسلم قوم کا وقار کس طرح بلند ہو۔ رہی یہ بات کہ عالم انسانیت کو درپیش بحران مثلاً ماحولیات کی تباہ کاری، اسلحوں کی دوڑ، ایٹمی جنگوں کے خطرات، استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کے کتے شکنجے، دولت کا چند ہاتھوں میں

ارتکاز، بین الاقوامی کمپنیوں کی اجارہ داری، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کا نظام استحصال اور گلوبلائزیشن کے ذریعہ پوری دنیا پر کتے شکنجے، جیسے خطرات کے سلسلے میں مسلم دنیا سے کوئی ایسی موثر آواز بلند نہیں ہو رہی ہے جس پر دنیا کے کان کھڑے ہو سکیں، یا جس کے سبب دیگر اقوام کے یہاں یہ تاثر پیدا ہو کہ ہم اپنی ناک سے آگے بھی دیکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج اسلام ایک ایسے نظریہ کے طور پر سامنے آیا ہے، جو صرف مسلم فرقہ کے مفادات کا تحفظ کر سکتا ہے، بھلا کسی ایسے اسلام میں دیگر اقوام کے لئے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اسلام کے اس فرقہ وارانہ ایڈیشن میں جسے قومی مسلمانوں نے گذشتہ چند صدیوں میں تشکیل دیا ہے، دیگر اقوام کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک ایسے نظریہ کے طور پر دیکھتی ہے جسے اگر کامیابی مل گئی تو ان کا مستقبل تار تار ہو جائے گا۔ اقوام عالم پر مغربی اقوام کی موجودہ سبقت یکسر ختم ہو جائے گی۔ حالیہ برسوں میں امریکہ کی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف جو ہم جاری ہے اس کے پیچھے دراصل قومی اسلام سے متعلق یہی وہ اندیشے ہیں جس نے مغربی دانشوروں کو تہذیبوں کے مابین جنگ کا بلگل بجانے پر آمادہ کیا ہے۔

لیکن حقیقت صرف اتنی نہیں، اس مسئلہ پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حالیہ برسوں میں کمیونزم کے زوال اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کی کامیابی نے مغرب میں مابعد تاریخ (post-era sensibilities) کے احساسات کو عام کیا ہے۔

مغربی دانشور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ایک طویل کشمکش کے بعد بالآخر جمہوریت کی فتح نے انسانی تاریخ کو اس کی منتہی تک پہنچا دیا ہے۔ آگے کی معنویت کے سلسلے میں ان کے ذہنوں میں ایک پراسرار خلا پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف اسلامی حلقوں کی جانب سے مزاحمت کا سلسلہ ابھی پوری طرح رکا نہیں ہے۔ اس صورت حال نے مغرب کو شاید یہ سمجھنے پر مجبور کیا ہے کہ مزاحمت کی اس آخری آواز کا قلع قمع کئے بغیر جمہوریت کو مکمل اور حتمی فتح نہیں دلائی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم حلقوں سے اٹھنے والی نسبتاً کمزور اور نجیف آوازوں کو بھی مغرب ایک بڑے خطرے کے طور پر دیکھتا ہے اور بسا اوقات کمزور مزاحمت کو بھی ذرائع ابلاغ اس طرح دکھاتے ہیں گویا اگر اس سے فی الفور نہ ہٹا گیا تو تمام اقوام عالم کا سکون خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ اسلام اور مغرب کی اس کشمکش میں ذرائع ابلاغ دانستہ طور پر اسلام کی شبیہ دانداز کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ البتہ اس پورے منظر نامہ میں جو چیز سب سے زیادہ تشویشناک ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے اٹھنے والی ان آوازوں میں کہیں بھی وہ پیمرانہ وسعت دکھائی نہیں دیتی

جو ابتدائی عہد میں مسلمانوں کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ اگر مسلم اہل فکر اور علمائے اسلام اپنی تمام تر توجہ اس بات پر صرف کرتے رہے کہ مسلمانوں کا قومی دبدبہ کس طرح قائم ہو، فرقہ مسلم کو اقوام عالم میں کس طرح باوقار مقام عطا کیا جائے اور اگر آخری نبی کے تبعین کے حلقوں سے عام انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ہانکے پکارے آواز لگانے والے معدوم ہو جائیں تو پھر دنیا کو پیپیرانہ آواز کہاں سے سنائی دے گی۔ جب تک اسلام کی دعوت لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلاتی رہی، اسی خدا کی طرف جو صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کا رب ہے۔ اسلام کی دعوت ایک بین الاقوامی صداقت کا مظہر تھی لیکن جب سے اسلام کو مسلمانوں نے قومی افتخار کے پروجیکٹ میں تبدیل کر دیا اسلام عبودیت کے بجائے محض ایک قومی شناخت بن کر رہ گیا، ایک ایسی قومی شناخت جس میں دوسروں کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی۔

اسلام کے نظری قالب میں تبدیلی یا انحراف کا یہ عمل عہد عباسی کے ابتدائی ایام میں راہ پانے لگا تھا جب بعض سیاسی عوامل کے زیر اثر ہمارے فقہاء اسلام کو ایک آفاقی پیپیرانہ دعوت کے بجائے مسلم سلطنت کی نظری بنیاد کے طور پر دیکھنے لگے تھے۔ اسی عہد میں دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاحوں میں دیکھنے کا رجحان تشکیل پایا اور یہ بحث بھی شد و مد کے ساتھ سر اٹھانے لگی کہ مسلمان ہونے کے لئے لازم عقائد کیا ہونے چاہئے۔ خلافت منہاج النبوة سے منحرف ہو چکی تھی۔ اولوالامر کے منصب پر ملوک و سلاطین کی حکمرانی نے اسلام کو ایک ایسی نظری قوت کے طور پر پیش کیا جو مسلم سلطنت کی توسیع کے لئے نظری بنیاد فراہم کرتا ہو۔ اس عہد میں نہ صرف یہ کہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مسلمان کون ہے بلکہ فقہاء نے جمہور مسلمانوں کے لئے اہل سنت والجماعت کے نام سے عقائد کا ایک بنیادی محضر بھی تیار کر ڈالا۔ خلق قرآن کی بحث صرف فقہی یا فنی مویشگافی نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعہ سرکاری علماء کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اسلام کی تشریح و تعبیر پر اپنا کنزول مستحکم کر لیں اور اس طرح اسلام کو سلطنت کی خدمت پر مامور کرنے کی راہ ہموار ہو جائے۔ گو کہ اس عہد میں ابن حنبل اور دیگر اہل حق اس مہم میں پوشیدہ خطروں کو بھانپ گئے اور اس کے خلاف حتی المقدور مزاحمت بھی کی لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود آفاقی اسلام کو مسلمانوں کے ثقافتی ورثہ میں محدود کرنے سے نہ بچایا جاسکا۔ اسلام ایک پیپیرانہ دعوت کے بجائے مسلم ریاست کے نظری حلیف کے طور پر سامنے آیا اور علماء انبیائی دعوت کے امین بننے کے بجائے اسی منحرف ریاست کے شیخ الاسلام بننے پر قانع ہو گئے۔ قرآن جو کبھی تمام عالم انسانیت کے لئے کتاب بشارت سمجھی جاتی تھی اب صرف مسلمانوں کی مذہبی کتاب بن کر رہ گئی حتی کہ وہ تمام قرآنی آیات جن میں اہل کتاب اور اہل ایمان

کے دیگر طائفوں کے لئے ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ کی بشارت دی گئی تھی ہمارے فقہاء نے اپنی فقہی موٹوگانیوں کے زیر اثر انہیں منسوخ کر ڈالا اور نجات سے متعلق ان نازک اور حساس موضوع پر فیصلہ کرنے بیٹھ گئے جسے خدا نے اپنے خصوصی دائرہ اختیار میں رکھا تھا اور جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد تھا ﴿إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾۔

قرآن کلام اللہ ہے تو کن معنوں میں؟ کیا اللہ نے محمدؐ سے بزبان عربی کلام کیا؟ یا اس نے اپنا پیغام محض اپنے رسول کے قلب پر نازل کیا۔ خدا کا کلام جسے انسانی زبان بیان کرنے سے قاصر ہے ایک انسانی زبان میں کس طرح ظہور پذیر ہوا؟ کیا قرآن کا کلام اللہ ہونا اسی معنوں میں ہے جس طرح حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے یا جسے عیسائی لٹریچر میں Logos سے تعبیر کرتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا براہ راست تعلق اسلام کے اس ایڈیشن سے ہے جو عہد عباسی میں تشکیل پایا تھا اور جو سلطنت کے سرکاری نظریہ کے طور پر معروف ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ محمد رسول اللہ پر جب خدا نے اپنی وحی نازل کی تو وہ جزیرۃ العرب کا ایک تاریخی منظر نامہ تھا لیکن یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ آپ کی حیثیت رسول عربی کے بجائے ایک عالمی پیغمبر ﴿كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ کی ہے اور اسی لئے قرآن متبعین محمدؐ کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ وہ قومی شناخت قائم کرنے کے بجائے نظری شناخت کے حامل ہوں۔ لیکن ﴿كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۖ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا﴾ پر از حد اصرار کے باوجود صبغة اللہ اختیار کرنے کی طرف ہماری توجہ کم ہی گئی۔ لسانی ثقافتی شناخت کے بجائے صبغة اللہ پر اصرار اور ﴿كُونُوا رَبَّانِيِّينَ﴾ کی دعوت اس بات سے عبارت تھی کہ محمد رسول اللہ کے متبعین نہ تو کسی مقامی ثقافت کے اسیر ہوں گے اور نہ ہی کوئی جغرافیائی یا لسانی شناخت ان کا طرہ امتیاز ہوگی۔ لیکن عملاً یہ ہوا کہ عباسی فقہاء کے زیر اثر اسلام کی آفاقی دعوت عروبہ کی سرحدوں میں محدود ہو گئی۔ آج بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ کیا عرب ثقافت کے بغیر اسلام کا کوئی قالب تشکیل پا سکتا ہے یا یہ کہ قرآن مجید کے معانی عربی زبان کے لغوی اور جاہلی شعری استعمال سے ماوراء سمجھے جاسکتے ہیں یا نہیں۔

بالفاظ دیگر کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن مجید کی تشریح و تعبیر میں عربی زبان کی وجہ سے عرب اقوام کو ہمیشہ فوقیت کا حامل بتایا جائے یا غیر عرب اقوام کے لئے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ لسانی موٹوگانیوں سے ماوراء کتاب ہدایت کی حیثیت سے اس پر اتنا ہی حق جتانیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جس نے ماضی میں مسلم اہل فکر کو قدرے حیرانگی اور تذبذب میں مبتلا رکھا ہے۔ مثال کے طور پر جب محمد اقبال نے خلافت عثمانی کے زوال

کے بعد اس امید کا اظہار کیا کہ اب سرکاری تعبیری نظام کے معدوم ہو جانے سے ایک ایسے اسلام کی بازیافت ممکن ہو سکے گی جو عرب ثقافت کی چھاپ سے آزاد ہو تو شاید ان کے ذہن میں اسی آفاقی اسلام کا تصور تھا جو اٹھا تو عرب کی سرزمین سے تھا لیکن اس میں غیر عرب اقوام کے لئے یکساں نجات کی بشارت سنائی دیتی تھی۔ اقبال کی توقع کے برعکس ہمارے عہد میں اسلام کے ایک ایسے آفاقی ایڈیشن کی بازیافت، جو عربیت اور دوسرے ثقافتی قالب سے ماوراء ہو، اب شاید اتنی آسان نہیں رہی۔ ہمارے عہد میں زبان کے سلسلے میں بعض ایسے نظریے وضع ہوئے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ کسی متن میں وہی کچھ نہیں ہوتا جس کا اظہار الفاظ کرتے ہیں کہ ہر قاری کے دل و دماغ میں الفاظ کی جہتیں اور معانی کی پرت مختلف ہوتی ہے۔ گویا پڑھنے والا صرف متن ہی نہیں پڑھتا بلکہ اپنے رجحانات کو بھی متن میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ ایک ایسا غیر محسوس عمل ہے جس سے بچنا مشکل ہے۔

Deconstruction کی فلسفیانہ موٹو گانیوں نے ہمارے بعض مسلم اہل فکر کو غلط حیرت میں ڈال دیا ہے جس سے اس بات کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ متن کو اپنے ذہنی رجحانات کے زیر اثر پڑھنے کی یہ لے ہمیں کہیں اس کے اصل پیغام سے ہی محروم نہ کر دے۔

معاصر علماء میں محمد ارون اور نصر ابوزید ان لوگوں میں سے ہیں جو وحی ربانی کی تشریح و تعبیر میں ان سوالات تک جانکے ہیں جن کا جواب انسانی عقل فراہم نہیں کر سکتی۔ عہد رسول میں بھی جب پوچھنے والوں نے یہ پوچھا کہ خدا کس طرح وحی کا نزول اپنے پیغمبر پر کرتا ہے تو اس بارے میں صرف اتنی بات کہی گئی کہ یہ امر ربی ہے۔ گویا سوال کا یہ حصہ کہ قرآن مجید معانی اور متن ہر اعتبار سے کلام الہی ہے اسی پرانی بحث کو تازہ کرتا ہے جو خلق قرآن کے حوالے سے کبھی عہد عباسی میں ہمارے انتشار فکری کا سبب بنی تھی۔ بات یہ ہے کہ نزول وحی کا پورا عمل انسانی حیثیت ادراک سے باہر ہے۔ یہ وہ ممنوع وادیاں ہیں جن میں ہمارا داخلہ قرآن اور وحی کی تعبیر و تفہیم میں مدد کرنے کے بجائے ہمارے ہوش و حواس کو بری طرح مجروح کر دیتا ہے۔ ایک ایسے وثیقہ وحی کو جو فی نفسہ لازوال ہو زمان و مکان کی قیود سے ماوراء سمجھنے کی کوشش مستحسن سمجھی جائے گی، البتہ انسان جو زمان و مکان کا قیدی ہے اس عمل سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ کہ نئے سیاق میں اس کتاب ہدایت کو از سر نو سمجھنے کی کوشش کریں اور معانی کی ان تہوں تک پہنچنے کی کوشش کریں جہاں ہمارے متقدمین بوجہ پہنچنے سے قاصر رہے تھے۔ قرآن بلاشبہ ایک لازوال وثیقہ وحی ہے لیکن اس کے تمام ابعاد کی تفہیم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم عہد رسول کے

زمان و مکان کے ابعاد سے صرف نظر کر سکیں۔ deconstruction age کے معاصر مفکرین جن میں محمد ارکون سرفہرست ہیں محض اس بات کی دعوت نہیں دے رہے ہیں کہ متن وحی کا نئے علوم مثلاً Anthropology اور Sociology کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے بلکہ وہ اپنی سادہ لوحی میں ان ممنوع وادیوں میں جانٹکے ہیں جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں اور جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی محدود دماغی ساخت کے ذریعہ وحی جیسے ماورائے ادراک عمل کو اپنے حیطہ ادراک میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارکون کے یہاں طریقہ ترسیل کو سمجھنے کی لمبی چوڑی تھکا دینے والی بحثوں کے باوجود قاری کو جدید لسانیاتی نظریوں اور فیشن ایبل اصطلاحوں کے علاوہ کچھ اور ہاتھ نہیں آتا۔

عہد رسول میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو طریقہ ترسیل کے عمل میں تاک جھانک کی نفسیات کا مظاہرہ کرتے ہوں، جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے۔ پوچھنے والوں نے پوچھا ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ﴾ اے محمد وہ تجھ سے نزول وحی کی بابت پوچھتے ہیں۔ ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ کہہ دیجئے ترسیل وحی بس امر ربی ہے، منشاء الہی ہے۔ (الاسراء: ۵۸)۔

ایک دوسرے سیاق میں قرآن نے ترسیل وحی کے تین طریقوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہاں بھی فی نفسہ اس طریقہ کی سریت سے پردہ نہیں اٹھایا گیا۔ شاید خدا اس راز کو بندوں پر افشا کرنا نہیں چاہتا۔ یا نزول وحی کا یہ سارا عمل اتنا پیچیدہ ہے کہ انسانی عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی اور یہ کیونکر نہ ہو خدا کے کلام کو جو ایک ایسی ہستی ہے جس کا کوئی شے احاطہ نہیں کر سکتی، انسانی زبان میں ڈھالنا لامکان سے مکان کی طرف ایک ایسا سفر ہے جس کا احاطہ انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ سریت کے اس پردے کے پیچھے کیا ہے اس بارے میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ واللہ اعلم۔

قرآن مجید کی ایک ایسی تعبیر جو عرب تاریخی اور ثقافتی پس منظر سے ماوراء ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا رشتہ زمانی اور مکانی طور پر عہد رسول کی عربی ثقافت سے پوری طرح منقطع نہ ہوا ہو ہمیں ایک ایسے اسلام کی بازیافت سے دوچار کر سکتا ہے جسے ہم اسلام کی سچی تعبیر کہہ سکیں۔ طریقہ ترسیل کے سلسلے میں ہمارا تجسس یقیناً ہمیں وحی کو سمجھنے میں کچھ زیادہ مدد نہیں کرتا اس کے برعکس ہمیں اپنی ساری توجہ اس امر پر مرکوز کر دینی چاہئے کہ متن کو اپنے عہد میں کتاب ہدایت کے طور پر کس طرح پڑھا جائے تاکہ متقدمین کی طرح ہماری موجودہ نسل بھی اپنے عقل و ادراک کی تمام تر پونجی وحی کو سمجھنے میں صرف کر سکے۔ گویا ہم جیتے تو موجودہ زمانے میں ہوں لیکن ہمیں عہد رسول میں مکانی سفر کا سلیقہ آتا ہو۔ تفہیم وحی کا یہی وہ منہج ہے جس

کے ذریعے آج ہماری اس پیہیرانہ آواز تک رسائی ہو سکتی ہے۔

قرآن یقیناً خدا کے الفاظ پر مشتمل ہے لیکن یہ الفاظ مردہ نہیں ہیں۔ یہ مسلسل نمود پذیر ہیں۔ یہ ایک ایسا prism ہے جس کے ذریعہ ہم ہر عہد کو مختلف روشنیوں میں گھرا دیکھتے ہیں۔ یہاں ماضی اور حال مجسم نظر آتا ہے۔ وحی کا یہ دفتر ہم سے اس بات کا طالب ہے کہ ہم اس کے مطالعہ میں اپنی تمام تر علمی فکری اور ذہنی توانائیاں صرف کر دیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ قرآن جیسی عظیم شے عام انسانوں سے اس بات کی طالب ہوتی ﴿اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد: ۲۴) جو لوگ الفاظ قرآنی کو ایک ایسا مجموعہ عبارت سمجھتے ہیں جو لغت کے ڈھانچے سے اپنی آخری شکل میں نکل چکا ہے وہ پھر اس بات پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ ان الفاظ کے معانی مخصوص تاریخی تناظر میں ہی متعین کئے جائیں ایسا کرنے والے نہ صرف یہ کہ الفاظ اور ان کے معانی کو منجمد کر دیتے بلکہ وہ وحی کا مطالعہ تاریخ کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک ایسا ماخذ ہے جس پر پوری طرح انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ کو وحی کی کلید قرار دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وحی ربانی کی موجودگی کے باوجود ہم اس سے روشنی حاصل کرنے سے محروم ہیں اور یہی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو وحی جیسے لازوال ماخذ کو Sociology یا Anthropology جیسے غیر نمونہ یافتہ علوم کے ذریعہ سے وحی کے مطالعہ کے داعی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ روایتی علماء جو تاریخ کے حوالے سے قرآن کے مطالعہ کے خوگر ہیں اور جدید دانش ور جو جدید نمونہ پذیر سماجی علوم کے توسط سے قرآن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں دونوں ہی کو اس بات پر اصرار ہے کہ تشریح و تعبیر کا حق انہیں ہی حاصل ہے۔

ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں اس میں ہر طرف ہر لمحہ زندگی کا سفر جاری ہے۔ کائنات ہر لمحہ اپنے آپ کو منکشف کر رہی ہے۔ اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لینا اور تشریح و تعبیر کو محض طبقہ خاص کا حق قرار دینا ایک بات ہے اور وثیقہ وحی کو اپنے خاص سابق میں از سر نو سمجھنے کا عزم کرنا بالکل دوسری بات۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو یہ رویہ ماضی میں مذہب کے نام پر نظام جبر کے قیام کا سبب بنا ہے۔ دوسری بات تو ہمارے عہد میں اپنی تمام تر علمی پونجی کو بروئے کار لاتے ہوئے تعبیر وحی کی از سر نو کوشش کا کام ابھی باقی ہے۔ مذہب کے نام پر جب بھی نظام جبر کے قیام کی کوشش ہوئی ہے اور جب بھی مذہب کے حوالے سے انسانی عقل پر پہرے بٹھانے کا غیر مستحسن کام کیا گیا ہے اس صورتحال نے ہمارے اجتماعی نظام کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ اہل یہود کے یہاں معبد کی مذہبی زندگی جسے دراصل احبار کی حکومت کہنا چاہئے، دوبار اپنے دردناک انجام کو پہنچی اور آج اہل یہود بھی یروشلم کی عظمت لوٹائے جانے کی راہ تک

رہے ہیں۔ یہودی علماء نے خدا کے عظیم آفاقی پیغام کو اپنی بند دماغ تشریحی کوششوں سے ایک فرقہ وارانہ ثقافتی دین بنا ڈالا۔ جس میں نجات کا امکان صرف اہل یہود کے لئے باقی رہ گیا۔ کچھ یہی صورتحال عیسائی دنیا میں پیدا ہوئی جہاں حضرت مسیح کے حوالہ کے بغیر نجات کا ہر امکان سرے سے مسترد کر دیا گیا۔ چرچ کے قائدین حضرت مسیح کے حوالے سے نجات کے پروانے جاری کرنے لگے۔ صورتحال یہاں تک آچھوچی کہ حضرت مسیح کے زبانی نام لیواؤں کے علاوہ تمام اقوام عالم پر نجات کا دروازہ بند سمجھا گیا۔

کچھ یہی صورت حال عثمانی خلافت کے ساتھ پیش آئی جہاں اسلام کی آفاقی دعوت گم ہو گئی پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ محض اس کے نام سے سلطنت کا عظیم ڈھانچہ برقرار رہ پاتا۔ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب بھی مذہبی گروہوں نے آفاقی پیغام سے منھ موڑ کر ایک فرقہ وارانہ شناخت کو اپنا شعار قرار دیا ہے اور جب بھی انہوں نے دنیوی کامیابی اور اخروی نجات پر دوسری اقوام کے لئے دروازے بند کئے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی صورتحال میں پایا ہے جہاں سے نکلنے کے تمام راستے معدوم ہو گئے ہوں۔ جب وحی کی تعبیر فرقہ وارانہ ذہنیت کی اسیر ہو جائے تو انسانوں کو ایسا لگتا ہے کہ خدا کی کتاب کے الفاظ منجمد ہوں جس نے کبھی ان کے پرکھوں سے کلام کیا تھا، وہی پرکھے جنہیں ہر مردہ قوم Pious Elders یا سلف صالح سے تعبیر کرتی اور ان کی اتباع کو خدا اور اس کے رسول کی اتباع سے زیادہ اہم سمجھتی ہے۔ جب وحی کے لازوال الفاظ، ایسا محسوس ہو کہ، انسانوں سے کلام نہیں کر رہے ہوں تو عام انسانوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے آپ کو سلف صالحین کی غیر مشروط اتباع میں دے دیں۔ اس غیر تخلیقی اور غیر صحت مندانہ رویہ سے جھوٹی دینداری وجود میں آتی ہے۔ انسان رسوم دینداری کو غایت دین سمجھنے لگتا ہے۔ اور پھر مذہب کے نام سے مذہب کی نفی پر مبنی نظام جبر کا قیام عمل میں آ جاتا ہے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کی گردنیں انسانوں کی تابع داری سے آزاد ہوں اور اسی لئے وہ بندوں کی طرف اپنے پیغامبر بھیجتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جھوٹی دینداری کے امین مذہب کے نام پر اجبار کا نظام جبر قائم کر دیتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں خدا کے سچے پیغمبروں کو رسمی دینداری کے ہاتھوں جواذیتیں اٹھانی پڑی ہیں اس کی کوئی نظیر کسی دوسرے طبقہ کی طرف سے کی جانے والی مخالفت میں نہیں ملتی۔

آج ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ اس کے بارے میں مغرب میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ مابعد تاریخ کے احساسات نے مغرب کو اپنی تاریخ کے سب سے بڑے بحران سے دوچار کر رکھا ہے۔ مغرب میں فلسفہ کے زوال نے اسے ایک لسانیاتی خوشہ چینی کا فن بنا دیا

ہے۔ یہی حال مغربی جمہوریت کا ہے جو کسی نظام انصاف کے قیام میں ان ملکوں میں بھی ناکام رہی ہے جنہیں جمہوریت کا گرٹھ سمجھا جاتا ہے۔ آج نہ صرف یہ کہ جدید سائنس اپنے تمام ابعاد کے ساتھ علماء و مفکرین کے ہاں محل نظر ہے بلکہ مغرب میں مروجہ سماجی رویہ مثلاً اسقاط حمل، ہمزاد شادیاں اور رشیت ازدواج سے ماوراء جنسی تعلقات اب پھر سے موضوع بحث بن گئے ہیں۔ یہ وہ موضوعات تھے جن کے بارے میں کبھی سمجھا جاتا تھا کہ ان پر اب کسی گفتگو کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ جدید مغرب اپنی کشش کھو چکا ہے اب اس کے بطن سے کیا کچھ برآمد ہونے کو ہے اس بارے میں ابھی کچھ کہا جانا قبل از وقت ہے۔

گذشتہ چند دہائیوں میں بین المذاہب مکالموں اور اجتماعات کے لئے بڑا جوش و خروش دیکھا گیا ہے۔ مختلف مذاہب کے سعید نفوس اس مسلسل سمٹی ہوئی دنیا میں خود کو علاحدہ رکھنے میں دشواری محسوس کرتے اور انہیں یہ بات مسلسل کچھ کے لگاتی رہتی ہے کہ وہ اخروی نجات کے امکانات پر صرف اپنی اجارہ داری قائم رکھیں۔ لاطینی امریکہ کی لبریشن تھیولوجی، تائیوان کی ہوم لینڈ تھیولوجی، کوریا کی من یونگ تھیولوجی اور ہندوستان میں دلتوں کے حقوق انسانی کو تسلیم کرنے کے لئے کی جانے والی کوششیں، دراصل جدید دنیا کی باقیات ہیں جن کے خرابے سے ہمارے کانوں میں مسلسل ایک ایسی آواز آرہی ہے جسے مستقبل کا روحانی نغمہ کہا جاسکے۔ سمٹی سکڑتی دنیا نے انسانوں کو از سر نو اپنی بازیافت پر مجبور کیا ہے۔ فرقہ وارانہ دینیات کے بجائے ایک عالمی دینیات کی تشکیل کے لئے فضا کافی سازگار ہو گئی ہے۔ اسلام کے اس آفاقی پیغام کی بازیافت کا وقت گویا اب آپہنچا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کو مسلم قومی ورثہ کے بجائے رب العالمین کے لازوال پیغام کی حیثیت سے پیش کر سکیں تو وہ محسوس کریں گے کہ تمام اقوام عالم خدا کی نغمہ سرائی میں ان کے ساتھ شریک ہو گئی ہیں:

ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے

نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے

روز جزاء کا مالک ہے۔

اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد کے طلبگار ہیں

اے اللہ تو ہمیں سیدھے راستے کی رہنمائی فرما،

ان لوگوں کا راستہ جن کو تو نے انعام و اکرام سے نوازا،

نہ کہ ان لوگوں کا جن پر تیرا غیظ و غضب نازل ہوا۔ (قرآن ۱ : ۱-۲)



قرآن نے فرعون جیسے با اختیار مرد اور ابولہب جیسے بدویانہ افتخار کے حامل شخص کے لیے تباہی کی وعید سنائی ہے جبکہ دوسری طرف ملکہ سبا جیسی حق شناس عورت کی قیادت میں پوری قوم سبا کی راہ یابی کا مژدہ سنایا ہے۔ آج اگر مسلم معاشرہ میں عورتیں خود کو حاشیہ پر محسوس کرتے ہوئے پدرانہ مسلم معاشرہ میں اپنے سماجی رول کی از سر نو بازیافت کے لیے اپنے اندر امامت جیسے مسئلہ کو بزور بازو حاصل کر لینے کی ہمت پاتی ہیں تو اسے اس تاریخی تسلسل سے علاحدہ کوئی اجنبی عمل نہیں کہا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے پر متحیر ہونے یا اجنبیت کی نگاہ ڈالنے کے بجائے اسے اس وسیع تناظر میں دیکھیں۔

عورت کی امامت

کیا کسی مسلم خاتون کے لیے اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ وہ نماز جمعہ کی امامت کرے اور وہ بھی ایک ایسی صورتحال میں جب اس کے مقتدیوں میں عورتوں کے علاوہ مردوں کی بھی وافر تعداد موجود ہو؟۔ یہ وہ فقہی سوال ہے جس پر مسلم دنیا کے دارالافتاء اور مؤثر شخصیات مختلف انداز سے اپنی رائے دے رہے ہیں۔ شیخ یوسف القرضاوی نے، جنہیں عالم اسلام میں ایک معتبر عالم دین کی حیثیت حاصل ہے، اس مسئلہ پر شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے اس عمل کو دین سے انحراف پر مبنی قرار دیا ہے۔ دوسری طرف شیخ الازہر اور اس قبیل کے دیگر علماء عورت کی امامت کو سرے سے قابل استزاد تو نہیں ٹھہراتے البتہ ان کے خیال میں عورت کی امامت صرف خاتون مقتدیوں تک محدود ہونی چاہیے۔ سعودی عرب اور خود ہندوستان میں روایتی علماء نے اس عمل کو باعثِ گناہ بتایا ہے۔ ان علماء کرام کو اس بات پر شدید غصہ ہے کہ ایک ایسی صورتحال میں جب امت اسلامیہ پر خارج سے شدید حملے ہو رہے ہیں خود دختران امت فتنے کی اس نازک گھڑی میں اس قسم کے مباحث چھیڑ کر آخر کیا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ اس طرح کی کوششوں سے بالآخر فائدہ دشمن کو ہی پہونچے گا اور اس طرح امت کا ذہنی خلفشار اور فکری انتشار عام لوگوں پر کہیں زیادہ نمایاں ہو جائے گا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ پر غم و غصہ کے بجائے ٹھنڈے دل و مانغ سے غور کیا جائے کہ یہی عقل کا تقاضا ہے اور قرآن کی تعلیم بھی۔ فقہی اعتبار سے اگر اس سوال پر غور کیا جائے کہ مسلمانوں کے کسی اجتماع میں امامت کا اہل کون ہے؟ تو خود فقہاء کے نزدیک یہ چیز دیکھی جائے گی کہ جو ان میں نسبتاً تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو، دین کی فہم و بصیرت سے معمور ہو اور جسے قرآن مجید کی ترتیل کا بہتر سلیقہ حاصل ہو،

وہاں سرے سے یہ بحث نہیں آئے گی کہ ان اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل شخص مرد ہو یا عورت کہ قرآن نے نسلی یا جنسی شناخت کو سرے سے لائق اعتناء نہیں سمجھا ہے۔ کسی ذات کا عورت ہونا اس کے لیے سماجی اور دینی طور پر وجہ معذوری بن جائے، قرآنی دائرہ فکر سے اس خیال کی توثیق نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو تھا عورت کی امامت پر قرآنی دائرہ فکر میں رہتے ہوئے غور کرنے کا معاملہ۔ رہی یہ بات کہ فقہا ان مسائل پر کس طرح سوچتے ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کے یہاں صرف اس خیال سے ایک مباح کام کو ممنوع قرار دینے کی روایت موجود ہے جس کی بنیاد صرف اس اندیشے پر رکھی گئی ہو مبادا یہ عمل فتنہ کا سبب بن جائے۔ مثال کے طور پر عورتوں کے مسجد میں داخلے کے مسئلہ کو لیجئے۔ اسلام کی متواتر تاریخ اور امت کا متواتر عمل اس بات پر شاہد ہے کہ مسجد جو اسلام کا بنیادی سماجی ادارہ ہے اس میں عورتوں کی شمولیت کا عہد رسول سے التزام کیا گیا ہے۔ حرم کی اور مسجد نبوی میں یہ استمرار آج تک موجود ہے۔ گو کہ ماضی میں بعض حکام اور علماء نے مخلوط طواف پر روک لگانے کی کوششیں کیں لیکن ان کی یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ اس سلسلے میں عطا جیسے جلیل القدر محدث کی مزاحمت کا سلسلہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ البتہ حجاز مقدس سے دور جہاں فقہا کی فہم پر مقامی اثرات کہیں زیادہ حاوی ہو گئے انہوں نے اس خیال سے عورت کے سماجی رول پر قدغن لگا دی مبادا معاشرے میں اس کی آزادانہ چلت پھرت اور مسجدوں میں اس کی آمد و رفت زوال زدہ مسلم معاشرہ کو مزید فتنہ میں مبتلا کر دے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اگر مسلم مرد کی اخلاقی حالت قابل رحم تھی تو مرد کی اخلاقی تربیت کی جاتی۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ اس کی سزا عورتوں کو دی گئی اور انہیں مسجد جیسے مرکزی مقام سے انخلاء پر مجبور کر دیا گیا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ زوال کے پر آشوب دور میں اپنا دین بچائے رکھنے کے لیے اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلم خواتین سے قرآنی احکام حجاب کے علاوہ مزید اضافی پردے کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ چہرے اور ہتھیلیوں کے اکتشاف کی جو روایت قرن اول سے چلی آرہی تھی اور جس کی تائید میں آج بھی تاریخ و احادیث کی کتابوں سے بے شمار دلیلیں لائی جاسکتی ہیں اسے کالعدم قرار دیا گیا۔ گو کہ علماء کے درمیان چہرے کے پردے کا مسئلہ آج تک متنازع ہے البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چہرے کے پردے کو دین کی محتاط ترین تعبیر قرار دینے کے نتیجے میں آج مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی اسے دین کی صحیح تعبیر سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ یہاں بھی دراصل احتیاط کا وہی مفروضہ اصول کارفرما ہے کہ اگر تمام جسم کو ڈھکنے کے بعد بھی چہرہ کھلا رہ گیا تو زوال زدہ معاشرہ میں فتنہ کا سد باب ممکن نہ ہوگا۔

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض حلقوں میں اب یہ خیال عام ہے کہ غیر مردوں کے لیے عورت کی آواز کا سننا حرام ہے اور بعض مسلم سماج میں آج بھی خواتین کے نام کو منکشف یا متعارف کرانا اسلامی قدروں کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ احتیاط کے اس فلسفہ کا سب سے زیادہ خمیازہ مسلم خواتین کو بھگتنا پڑا کہ صدیوں پر مشتمل اس پورے احتیاطی عمل میں وہ بے چہرہ، بے نام اور بے آواز ہو کر رہ گئیں۔ ایک مسلمہ کی حیثیت سے انہیں اپنے سماجی اور دینی رول سے دست بردار ہونا پڑا۔ دوسری طرف جو لوگ مسلم معاشرہ کے زوال کو روکنے کے لیے اٹھے تھے ان کی ساری توجہ عورتوں کو قابو میں رکھنے میں صرف ہو گئی، مردوں کی خاطر خواہ اصلاح کا کام ان کے پروگرام سے محو ہو گیا۔ فی زمانہ جو لوگ عورت کی سماجی، سیاسی یا مذہبی قیادت کو صرف اس بنیاد پر رد کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا کرنا ایک نئے فتنہ کا موجب ہو سکتا ہے وہ دراصل قدامت کی اسی روش پر گامزن ہیں جس کے نتیجے میں ہمارے جاری زوال کی رفتار میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

اسلام نام ہے خود سپردگی کا۔ یہ خود سپردگی مردوں سے بھی اسی قدر مطلوب ہے جتنی عورتوں سے۔ ہمیں یہ بات تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہونا چاہیے کہ خدا اور اس کا رسول اس بات کو کہیں بہتر سمجھتا ہے کہ کون سی چیز باعث فتنہ ہے اور کس عمل سے انسانی معاشرہ کا توازن برقرار رہ سکتا ہے۔ اگر اللہ نے مسلم خاتون کو مسلم مرد کی طرح مسجد کی دینی و سماجی زندگی میں شرکت کا حق دیا ہے اور اگر اسے رسول اللہ نے اپنے عہد میں عمل کی سند بخشی ہے تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم بعد کے عہد میں اپنے ناقص فہم کی بنیاد پر عورتوں سے ان کا یہ حق چھین لیں۔ تاریخ اسلام کا معمولی طالب علم بھی اس بات سے واقف ہے کہ عہد رسول کی سماجی زندگی میں عورتوں کی چلت پھرت، ان کے ناموں اور چہروں کا معروف ہونا، تجارت اور حرفت میں ان کی شرکت، معمول کی بات تھی۔ خلفائے راشدہ کے عہد میں سیاسی امور پر ان سے مشاورت طلب کی جاتی اور ایک غیر معروف چھٹی ناک والی عورت عمرؓ جیسے صاحب الرائے خلیفہ کو عین خطبہ میں ان کی تعبیری لغزشوں پر برملا متنبہ کرنا اپنا فرض جانتی۔ اسلام کی اس ابتدائی معاشرت کو اگر متصور کیجئے تو اکیسویں صدی کی ابتدا میں کسی مسلم خاتون کے نماز جمعہ پڑھانے کی بات کوئی قابل حیرت واقعہ نہیں معلوم ہوتا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے خطبات بہاول پور میں قرن اول سے ایسے دو واقعات کا ذکر کیا ہے جس میں عورت کی امامت کا تذکرہ ملتا ہے، اگر یہ تاریخی واقعات کتابوں میں موجود نہ ہوتے جب بھی ہمیں یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہونی چاہیے تھی کہ اسلام نے تقویٰ کے جس بنیادی جوہر کو بارگاہ الہی میں قبولیت کی شرط قرار دیا ہے اور جو مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں جوہر امتیاز ہے، اس کے بعد اس بات کی گنجائش ہی کہاں

رہ جاتی ہے کہ کوئی شخص صرف اس بات پر فخر کرے کہ وہ کسی خاص نسل، خطے، رنگ و نسل یا جنس کا حامل ہے۔ قرآن نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ کسی شخص کا عمل صرف اس لئے ساقط الاعتبار نہیں ہو سکتا کہ وہ وہی طور پر کسی خاص گروہ یا جنس میں پیدا ہوا ہے۔ ﴿انسی لا اضيع عمل عامل منکم من ذکر او انسی بعضکم من بعض﴾ (آل عمران: ۱۹۵) جہاں اس بات کی ضمانت دی جا رہی ہو کہ کسی کا ذرہ برابر بھی عمل رائیگاں نہ جائے گا ﴿و لا تکسب کل نفس الا علیہا و لا تزر وازرة وزر اخرى﴾ (الانعام: ۱۶۴) اور یہ کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا (کل نفس بما کسبت رھینہ) جہاں تمام شناختیں جھوٹی قرار پاتی ہوں، مرد اور عورت سبھوں کے لیے صبغة اللہ کو اختیار کرنے کی تلقین ہو وہاں اس کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص محض اپنی مردانہ وجاہت کو متبع مؤمن عورتوں پر تفوق کے لئے پیش کر سکے۔ قرآن نے فرعون جیسے با اختیار مرد اور ابولہب جیسے بدویانہ افتخار کے حامل شخص کے لیے تباہی کی وعید سنائی ہے جبکہ دوسری طرف ملکہ سبا جیسی حق شناس عورت کی قیادت میں پوری قوم سبا کی راہ یابی کا مژدہ سنایا ہے۔ گویا مرد و عورت، سیاہ و سفید، نسل و وطن ہر وہ چیز جو انسان کی وہی میراث ہو اس کو کالعدم قرار دیتے ہوئے اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ خدا کے نزدیک جو چیز قابل ستائش ہے وہ محض عمل صالح ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں مسلمان تو مسلمان اہل اسلام کے علاوہ بھی دوسری قوموں کے صالحین سے بے انصافی نہیں کی جائے گی۔ ان کا اجر ضائع نہیں ہوگا۔ ایک ایسی کتاب کے ماننے والے جس کے پینات جابجا اس بات کی صراحت کر رہے ہوں کہ رنگ و نسل، جنس و جغرافیہ، شمال و جنوب، عرب و عجم کے تمام غیر فطری امتیازات مٹا دئے گئے ہیں جس کی جھولی میں عمل صالح ہے وہ فیصلہ کے اس دن کا انتظار کرے جب خود بار الہا کھڑے کھوٹے میں فیصلہ کر دے گا۔ اس سے پہلے کسی ذمہ دار اور خدا شناس اہل ایمان کو اس بات کی ہمت کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ کسی کو گنہگار یا واصل جہنم بتائے کہ ان بڑے امور کا فیصلہ تو خدا نے اس دن کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔

﴿بأي ذنب قتل﴾ سے دینی اور سیاسی رہنمائی تک عورت نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ محمد رسول اللہ نے اکرام آدمیت کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا دنیا کے مختلف گوشوں میں اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ صرف امت مسلمہ اس نبوی تحریک کی برکات سے فیضیاب نہیں ہوئی بلکہ معاشرے کے دوسرے دبے کچلے لوگوں کو بھی اس کا وافر فائدہ پہنچا۔ سود کی دلدل میں پشہا پشت سے پھنسنے خاندانوں نے راحت کی سانس لی، غلامی کا ادارہ رفتہ رفتہ اس سرزمین سے غائب ہو گیا۔ اسی طرح عورتوں کو مردوں کا

دست نگر بنائے رکھنے کی جاہلی روایت کا خاتمہ ہوا۔ ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ (التوبة: ۶۷) کے نشاط انگیز پیغام نے اس خیال کی جوت جگائی کہ اب انسانی معاشرے کو سپردگی کی راہوں پر لے چلنے میں عورت اور مرد کا برابر کا رول ہوگا۔

عہد رسول میں جس انقلاب کی بناء رکھی گئی تھی اس کے تمام ثمرات اس عہد میں حاصل نہیں ہو گئے تھے کہ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو آگے کی تاریخ اور آخری رسول کی معنویت کیا رہ جاتی؟ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عہد رسول میں جو ثمرات حاصل نہیں ہوئے اسے آئندہ بھی نہیں ہونا چاہیے یا جو لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ جو کام عہد رسول میں نہ ہوا ہوا سے آنے والی صدیوں میں انجام دینا قرب قیامت کی علامت کا ظہور ہے وہ دراصل آخری رسول کی معنویت اور قرآن کی ابدیت کا صحیح ادراک نہیں رکھتے۔ ورنہ ان کے پاس آخر اس سوال کا کیا جواب ہے کہ قرآن میں غلاموں سے حسن سلوک کے جو آداب بتائے گئے ہیں ان کا فی زمانہ اس لئے انطباق نہیں ہو سکتا کہ اب غلامی کا قدیم ادارہ باقی نہیں رہا۔ ہم اس واضح اور روشن حقیقت کا کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ قرآن میں غلاموں سے حسن سلوک یا ان کو آزاد کرنے کی ترغیب کے نتیجے میں لامحالہ ایک نہ ایک دن اس ادارہ کا خاتمہ یقینی تھا۔ گویا یہ ترغیب و احکام ایک بڑے سماجی انقلاب کی ابتدا تھی، انتہا نہیں۔ ان کے واقعی اثرات تو آنے والی صدیوں میں ہی مجسم ہونے تھے۔ اسی طرح قرآن میں احکام زکوٰۃ کو پڑھ کر کوئی شخص اس نتیجے پر نہیں پہنچتا کہ قرآن غرباء کا ایک طبقہ باقی رکھنا چاہتا ہے تاکہ امراء اپنی دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان کی طرف ملتفت ہوں۔ کچھ یہی حال مسلم معاشرہ میں عورت کے ارتقائی سفر کا ہے۔ عہد رسول میں عورت کو مرد کے بالمقابل جس طرح ایک مساوی شخصیت کے طور پر تسلیم کیا گیا اور جس طرح سماجی سرگرمیوں کے دروازے اس پر کھولے گئے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آنے والی صدیوں میں علم و تقویٰ کی بنیاد پر عورتیں سماجی زندگی کے اعزاز و اکرام پر اپنا دعویٰ قائم کریں۔ اسلام نے عورتوں کے امپاورمنٹ کی جو بنیاد رکھی تھی اس کے وسیع اور دور رس اثرات مسلم معاشرہ سے باہر بھی پڑتے رہے ہیں۔ مغرب میں آزادی نسوان کی تحریکیں، سماجی اور سیاسی انصرام میں ان کی شمولیت، رائے دہی کا حق، انفرادی آزادی کی ضمانتیں یہ سب اچانک خلا سے وجود میں نہیں آ گئی ہیں۔ ان کے پیچھے بھی دراصل اسی نبوی تحریک کے اثرات ہیں جو صدیوں کے ثقافتی تعامل کے نتیجے میں مغربی اقوام تک پہنچی ہیں اور جہاں وحی سے بے نیازی کی وجہ سے شخصی آزادی کی تحریکیں آج افراط و تفریط کا شکار ہیں۔

انسانی معاشرہ مسلسل نمو پذیر ہے۔ آپؐ نے مکہ میں اکرام آدمیت کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا

اس کا سلسلہ روکے نہیں رک سکتا۔ انسانیت کے سفر میں جن لوگوں کی نگاہیں میکنا کارٹر سے آگے نہیں دیکھ پاتیں یا جو یہ سمجھتے ہیں کہ یونیورسل ڈیکلریشن آف ہیومن رائٹس سے پہلے انسانی تاریخ کا سفر منجمد تھا وہ دراصل دانستہ تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ آج دنیا میں اکرام آدمیت کی جتنی باتیں ہو رہی ہیں یا دنیا کو تباہی سے بچانے، نیوکلیر جہنم سے محفوظ رکھنے، ماحولیات کی فکر گیری، انسانوں سے بڑھ کر جانوروں بلکہ دوسری مخلوق کے انقطاع نسلی کے اندیشے، ہواؤں کی تطہیر کے منصوبے اور سمندروں کی فطری آب و تاب کو برقرار رکھنے کی کوششیں، ان سبھوں کے تانے بانے اسی نبوی تحریک سے ملتے ہیں۔ آج اگر مسلم معاشرہ میں عورتیں خود کو حاشیہ پر محسوس کرتے ہوئے پدرانہ مسلم معاشرہ میں اپنے سماجی رول کی از سر نو بازیافت کے لیے اپنے اندر امامت جیسے مسئلہ کو بزور بازو حاصل کر لینے کی ہمت پاتی ہیں تو اسے اس تاریخی تسلسل سے علاحدہ کوئی اجنبی عمل نہیں کہا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے پر متحیر ہونے یا اجنبیت کی نگاہ ڈالنے کے بجائے اسے وسیع تناظر میں دیکھیں۔ کسی انسانی عمل میں خواہ وہ ﴿فاستبوا العیارات﴾ کی تحریک ہی کیوں نہ ہو افراط و تفریط کا پیدا ہو جانا عیب نہیں کہ اس افراط و تفریط کی اصلاح کی گنجائش تو ہر لمحہ رہے گی۔ البتہ اگر ہم نے ان اقدامات کو صرف یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ دشمن کی سازش یا دین سے باغی مسلمانوں کا مردود عمل ہے تو ہم صورتحال کی صحیح تفہیم تک پہنچ سکیں گے اور نہ ہی ممکنہ اصلاح کا کوئی امکان باقی رہ جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کی چودہ صدیوں میں چند استثنائی تاریخی واقعات کو چھوڑ کر عورت کو مسجد کے منبر پر بحیثیت امام یا خطیب قبول کر لینے کی سماجی روایت مستحکم نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں کہ عورت کو فقیہہ، مدرہ اور معلمہ کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں مسلم مردوں نے کم ہی تکلف یا بجل کا مظاہرہ کیا ہے۔ البتہ اگر ہم اس اصول کو اپنے سامنے رکھیں کہ اسلامی تحریک کے اثرات، سب کے سب، عہد رسول میں ظاہر نہیں ہو گئے تھے بلکہ اس کے اثرات مستقبل میں بھی ظاہر ہوتے رہیں گے اور یہ کہ عالمی سطح پر ایک نبوی معاشرہ کے قیام کا منصوبہ ابھی شرمندہ تعبیر ہونا باقی ہے اور یہی آخری رسولؐ کی معنویت اور ان کے متبعین کے لیے جواز بقا ہے، تو پھر ہمارے غور و فکر کا انداز یکسر بدل جائے گا۔ ہم عورت کی امامت کے مسئلہ کو محض ایک فتنہ یا قرب قیامت کی علامت بتانے کے بجائے اس پر قرآنی محاکمے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ ہمارے خیال میں جو لوگ اس واقعہ کو غارت گری ایمانی کا سبب بتاتے ہیں وہ دراصل اپنے اندر قرآنی دائرہ فکر میں محاکمے کی ہمت نہیں پاتے یا اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ان کے لیے قدماء کی تعبیر اور ان کے فتاویٰ سب کچھ ہیں حتیٰ کہ وہ ان تعبیرات پر محاکمے کو بھی فتنہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بات اصولی طور پر درست نہیں کہ مستقبل کے دین کو اور اس دین کو جو آخری لمحہ تک ہماری رہنمائی کا دعویدار ہے اسے قدماء کی تعبیر کا تابع کر دیا جائے کہ ایسا کرنا وحی کو اس کے فریضہ سے معطل کر دینا ہے۔ بد قسمتی سے مسلم معاشرہ میں صدیوں سے قرآن کو محور غور و فکر سے پرے محض کتاب برکت کی حیثیت سے دیکھنے کا رواج عام ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ قدما بھی ہماری طرح انسان تھے۔ وحی کی تشریح و تعبیر، احکام کے استخراج و استنباط اور حکمت و مصالح کے تعین میں ان سے بھی غلطیوں کا صدور ہوا ہوگا۔ ہم اس بات کے سزاوار نہیں کہ ان کے التباس فکری کو اپنے کمزور کاندھوں پر ڈھوتے پھریں۔ ہمارے لئے ہماری اپنی فکری اور عملی لغزشیں ہی کیا کم ہیں کہ ہم قدما کی لغزشوں کا بوجھ بھی اٹھانا ضروری خیال کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نازک، حساس اور اہم مسئلہ پر قدیم فقہی ڈھانچے میں اظہار غیظ و غضب کے بجائے اس کا محاکمہ چودہ صدیوں پر محیط نبوی تحریک کے ارتقائی سفر کی روشنی میں کیا جائے۔ البتہ اس عمل میں نئے مجتہدین کے لئے لازم ہوگا کہ جس طرح وہ قدیم فقہ پر سماجی اور سیاسی اثرات کے شاکہ ہیں اسی طرح مسئلے کی تحکیم میں عہد جدید کے سماجی و سیاسی مضمرات سے بھی حتیٰ الامکان اپنا دامن بچائے رکھیں۔



قرن اول میں قرآن مجید مسلمانوں کے درمیان آخری فیصلہ کرنے والی کتاب تھی جس کے آگے عامی اور دانشور علماء اور عوام سب اپنا سر تسلیم خم کرتے تھے، یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ خلیفہ وقت کی قرآن فہمی پر ایک بدوی عورت سوالیہ نشان لگا سکتی ہے، مسلم معاشرہ میں بدوی عورت کا یہ علامتی کردار جب تک زندہ رہا عورت کے سماجی رول یا اس کے حقوق پر مصالح امت کے نام سے روک لگایا جانا ممکن نہ ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم خواتین قرآن کے تازہ بہ تازہ مطالعہ کی اس روایت کو زندہ کریں جس کے زیر اثر ایک اعرابیہ حضرت عمر کی قرآن فہمی پر سوالیہ نشان لگا سکتی ہے، کہ جب تک مسلم معاشرے سے چھٹی ناک والی عورت غائب رہے گی نہ تو عورتوں کو ان کا گم شدہ سماجی رول واپس مل سکتا ہے اور نہ ہی مسلم معاشرے کو اس کی نصف مفلوج شدہ توانائی واپس مل سکتی ہے۔

کہاں گئی وہ چپٹی ناک والی عورت؟

مسلم معاشرے میں عورت ہنوز ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اہل تقویٰ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسے ذرا سی ڈھیل دی گئی یا اجتماعی زندگی میں اسے داخل ہونے کا موقع دیا گیا تو پھر فتنے کے نئے نئے دروازے کھل جائیں گے، اخلاقیات کی حدیں پامال ہو جائیں گی اور پھر نہ جانے کیا کیا کچھ ہوگا جس کا صحیح تصور تو یقیناً اہل تقویٰ کی بصیرت افروز آنکھیں ہی کر سکتی ہیں، البتہ اس عہد میں جب اسلام اور مسلمانوں پر بدترین شکست اور ذلت کا عذاب طاری ہے اور اس صورت حال سے بظاہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں دکھتا، تاریخ کے اس نازک موڑ پر مضطرب فکر مند اور ذی فہم مسلم خواتین سوالی ہیں کہ صدیوں کی مردانہ قیادت نے مسلم معاشرے کو اگر زوال کی اس صورت حال سے دوچار کر دیا ہے تو آخر کب تک محض فتنے کے خوف سے وہ خود کو عضو معطل بنائے رکھیں اور یہ کہ کیا ایسا کرنا اسلام اور مسلمانوں کے مفاد سے پہلو تہی اور مجرمانہ تساہل نہیں قرار پائے گا، یہ وہ سوال ہے جو اب ان روایتی معاشروں میں بھی پوری شدت کے ساتھ سراٹھا رہا ہے جہاں اب سے چند سال پہلے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ عورت کو سماجی منظر نامے سے بے دخل کرنے کے باوجود اسلامی زندگی کی بساط اسی تزک و احتشام کے ساتھ سجائی جاسکتی ہے جو قرن اول کے مسلم معاشرے کا خاصہ ہوا کرتی تھی، لیکن اب ان روایتی معاشروں میں یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ بدوی ثقافت اور سماجی رسوم میں یہ قوت نہیں کہ وہ اسلام جیسے انقلاب انگیز تصور زندگی کا متبادل بن سکے۔

سعودی عرب جہاں وہابی علماء نے کتاب و سنت سے کہیں زیادہ سماجی مصالح کے پیش نظر عورت کو سماجی رول سے بے دخل کرنے، اسے مکمل ملفوف کرنے حتیٰ کہ اس کے نام اور شناخت کو پوشیدہ رکھنے میں ہی عافیت جانی تھی وہاں کتاب و سنت کا علم رکھنے والی ذی شعور مسلم خواتین اس سوال کو پوری شدت سے

اٹھارہویں ہیں کہ آخر کب تک عورتوں کو نئی مسلم تحریک میں بھرپور شمولیت اور سماجی منظر نامے میں شرکت سے روکا جاتا رہے گا، سعودی پرلیس میں یہ سوال بھی اٹھایا جاتا رہا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عورت کو ایک الگ شناخت کے ساتھ پیدا کیا ہے تو کتاب و سنت کے علمبردار علماء اسے علیحدہ مسلم شخصیت کی حیثیت سے قبول کرنے کے بجائے اسے عزیز و اقارب یا محرم مردوں کے فقط حاشیہ بنے رہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ آخر علماء کے پاس اس بات کے لئے کیا دلیل ہے کہ وہ عورتوں کو سیاسی اور سماجی رول سے محروم کر دیں۔

مسلم معاشرے کی موجودہ تصویر جہاں عورت کو دین کے حوالے سے بعض لوگ گھروں میں محبوس کر دینا چاہتے ہیں یا بغیر کسی ثابت شدہ جرم کے عورتوں کو ان کے گھروں میں عمر قید کی سزا دینے کے طالب ہیں انہیں یہ جاننا چاہئے کہ ہماری یہ خود ساختہ دینی تصویر قرآن مجید کی اس دعوت انقلاب کے یکسر برعکس ہے جس میں مرد و عورت کو اس کی علیحدہ شناخت کے ساتھ برابر کا رکن تسلیم کیا گیا ہے۔ ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ (التوبة: ۶۷) یعنی اہل ایمان مرد و عورت نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، ایسا نہیں ہے کہ مرد تو تقویٰ کی فضا عام کرتے ہوں اور عورتیں فحاشی اور بے حیائی کے ذریعے معاشرے کو تباہ کرنے پر تلی پٹھی ہوں، عورت کے بارے میں اس طرح کے متعصبانہ خیالات اسلامی ثقافت کی نہیں بلکہ راہبانہ مسیحی اور بودھ ثقافت کی پیداوار ہیں۔ اہل کلیسا مدت تک اس بارے میں بحث کرتے رہے کہ عورت کو روح ہوتی بھی ہے یا نہیں کیوں کہ ان کے یہاں آدم کی لغزشوں کا بنیادی محرک حوا کو قرار دینے کا خیال عام تھا۔ اور اسی مسیحی تصور حیات میں یہ بات بھی عام طور پر تسلیم کی جاتی تھی کہ عورت مرد کی پہلی سے پیدا کی گئی ہے پھر اسے علیحدہ مکمل وجود کی حیثیت سے کیسے تسلیم کیا جاسکتا تھا، اس کے برعکس قرآن عورت اور مرد کو شخصیت کی ایک ہی سطح پر مکمل علیحدہ وجود کے طور پر تسلیم کرتا ہے ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكَ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾ مرد ہو یا عورت دونوں نہ صرف یہ کہ یہاں اپنے اپنے عمل کے لئے علیحدہ علیحدہ ذمہ دار ہیں بلکہ دونوں اس صلاحیت سے بھی متصف ہیں کہ وہ تقویٰ کے راستے پر ایک دوسرے سے آگے نکل جائیں، کسی کا محض مرد یا عورت ہونا اس کی تقویٰ شعاری میں خلل نہیں ہو سکتا ﴿إِنْ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ﴾۔ دل اگر مسیحائی کا متلاشی ہو تو عورت ہو کر بھی ملکہ سہانہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے تمام اہالیان ملک کے لئے بندگی رب کا وسیلہ بن جاتی ہے، اس کے برعکس فرعون و نمرود کا مرد ہونا بھی اسے کفر کی ذلت و رسوائی سے نہیں بچا سکتا۔

مسلم معاشرے میں عورت کے حاشیہ پر آجانے یا اسے غیر قرآنی اور غیر اسلامی پردے کے نام پر سماجی زندگی سے بے دخل کر دینے سے نہ صرف یہ کہ مسلم معاشرے کی آدھی قوت معطل ہوگئی بلکہ جن اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا باہم رفیق ہونا چاہیئے وہ ایک دوسرے کے متخارب ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے برسر منبر سماجی مصالح کے پیش نظر یہ فیصلہ لینا چاہا کہ مہر کی رقم اتنی کر دی جائے جسے عام آدمی بآسانی ادا کر سکے تو ان کے اس فیصلہ کو ایک اعرابی عورت نے چیلنج کر دیا، وہ کوئی معروف صاحب علم عورت نہیں تھی تاریخ کی کتابوں میں صرف یہ لکھا ہے کہ وہ ایک چھٹی ناک والی عورت تھی، اس کا کہنا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں مہر کے حوالے سے قطار من الفضة والذهب کا تذکرہ کیا ہے تو اے عمرؓ تمہیں اس بات کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ تم اس حق سے عورتوں کو محروم کر دو جسے اللہ نے ہمارے لئے روا رکھا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس قرآنی دلیل کے آگے حضرت عمرؓ نے اپنے سوچے سمجھے فیصلے کو فی الفور واپس لے لیا اور اس بات کا برسر مجلس اعتراف بھی کیا کہ عمر سے غلطی ہوئی جبکہ ایک عورت بات کو پاگئی، قرن اول میں قرآن مجید مسلمانوں کے درمیان آخری فیصلہ کرنے والی کتاب تھی جس کے آگے عامی اور دانشور علماء اور عوام سب اپنا سر تسلیم خم کرتے تھے، یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ خلیفہ وقت کی قرآن فہمی پر ایک بدوی عورت سوالیہ نشان لگا سکتی ہے، مسلم معاشرہ میں بدوی عورت کا یہ علامتی کردار جب تک زندہ رہا عورت کے سماجی رول یا اس کے حقوق پر مصالح امت کے نام سے روک لگایا جانا ممکن نہ ہوا۔ قرن اول کے مسلم معاشرے میں حضرت عائشہؓ کی ذات ایک عالمہ اور مفکرہ کی حیثیت سے تو خیر جہاں خصوصی امتیاز کی حامل تھی وہیں مدینہ میں ایسی صاحب رائے مسلم خواتین بھی موجود تھیں جن سے حضرت عمرؓ نے خلیفہ ثالث کے انتخاب کے لئے پینل بناتے وقت مشورہ طلب کرنا ضروری جانا۔ پھر آج اگر کچھ لوگ دین کے حوالے سے عورتوں کو الکشن کے عمل سے دور رکھنے، ان کی نمائندگی یا حق رائے دہندگی کے سلسلہ میں شبہات کے شکار ہوں تو ان کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہماری تاریخ اور اس قرآنی ثقافت سے نا آشنا ہیں جن کے سطحی حوالوں کے بغیر ان کی کوئی گفتگو مکمل نہیں ہوتی، علماء سے اپنی حق تلفی کی شکایت کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم خواتین قرآن کے تازہ بہ تازہ مطالعہ کی اس روایت کو زندہ کریں جس کے زیر اثر ایک اعرابیہ حضرت عمرؓ کی قرآن فہمی پر سوالیہ نشان لگا سکتی ہے، کہ جب تک مسلم معاشرے سے چھٹی ناک والی عورت غائب رہے گی نہ تو عورتوں کو ان کا گم شدہ سماجی رول واپس مل سکتا ہے اور نہ ہی مسلم معاشرے کو اس کی نصف مفلوج شدہ توانائی واپس مل سکتی ہے۔



نہ تو اسرائیل کے حکمرانوں کو مذہب یہود سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی فلسطینی اتھارٹی کے پیش نظر ارض فلسطین میں کسی عادلانہ معاشرے کا قیام ہے، لیکن دونوں طرف جو لوگ جانیں دے رہے ہیں وہ خالص مذہبی جذبے سے سرشار ہیں۔ جو صدق دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شہادت ایک مذہبی فریضہ ہے۔ کیا حکومت اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی کو برقرار رکھنے کے لئے یا مستقبل کی دو علیحدہ علیحدہ غیر توراتی اور غیر قرآنی ریاستوں کے قیام کے لئے دونوں طرف سے انسانی جانوں کے اتنے بڑے نذرانے کا کوئی جواز ہے؟

مسئلہ فلسطین: حق کے دو بول

عرصے سے ارض فلسطین ایک منصفانہ حل کا طلب گار ہے۔ اب تک دونوں جانب سے مسئلہ کا حل دریافت کرنے کی جو کوشش ہوئی ہے اس کے نتائج انتہائی حوصلہ شکن ہیں۔ انسانی جانوں کا اتلاف بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک طرف جدید ٹکنالوجی سے لیس حکومت اسرائیل ہے تو دوسری طرف مزاحمت کے لئے اٹھنے والی مختلف چھوٹی بڑی بے بس تنظیمیں۔ جن کے پاس انسانی جانوں کے علاوہ کوئی اور ہتھیار نہیں۔ گزشتہ پچاس برسوں میں دونوں طرف ایک دوسرے کے خلاف منافرت کا جذبہ حرارت اتا تیز ہوتا گیا ہے کہ اب اس ماحول میں عقل و انصاف کی ہر باتیں تحلیل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں دونوں طرف، کہیں کم اور کہیں زیادہ انسانی لاشوں کے ڈھیر لگتے جا رہے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ معرکہ آرائی دو ایسی قوموں کے درمیان برپا ہے جو خیر سے خود کو الہ واحد کا تابعدار گردانتی ہیں اور دونوں اپنی اس مذہبی جنگ کا جواز رب ابراہیم کی بندگی اور انبیاء کے مقدسات میں ڈھونڈتی ہیں۔ دونوں قوموں کے مذہبی اور سیاسی قائدین نے مسئلہ کو حق و باطل کا رنگ دے رکھا ہے۔ دونوں کے نزدیک ارض فلسطین کے ایک انچ پر بھی سودا نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی کسی قسم کی مصالحت جائز ہے۔ ایسی صورت میں مسئلہ کا منطقی حل تو یہی ہے کہ جس فریق کے پاس زیادہ قوت ہو وہ بزور بازو اس مسئلہ کو اپنے حق میں فیصلہ کر لے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں جہاں ریاست کو ٹکنالوجی کی غیر معمولی قوت حاصل ہو گئی ہے وہیں دوسری طرف گوریلا طرز کی دہشت بخش مزاحمت کمزوروں اور بے بسوں کے ہاتھوں میں ایک ایسے ناقابل شکن ہتھیار کے طور پر آگئی ہے جسے کسی ریاست کے لئے حتمی طور پر ختم کر ڈالنا ممکن نہیں۔ اسرائیلی جانتے ہیں کہ ریاست کی تمام تر فوجی قوت کے باوجود فلسطینیوں کو صفحہ ہستی سے ختم نہیں کیا جاسکتا اور فلسطینی بھی اس

بات سے خوب واقف ہیں کہ ان خود کش دھماکوں سے ریاست اسرائیل کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا ممکن نہیں۔ لیکن دونوں فریق اپنی خود ساختہ تقدیری تاریخ کے الجھاوے میں کچھ اس طرح پھنس کر رہ گئے ہیں کہ اب وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ دونوں ہی ایک طویل، بلامارنے والی، اعصاب شکن جنگ سے تھک چکے ہیں لیکن اپنی غیرت قومی کے سبب دونوں میں سے کوئی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔

تاریخ کے ایسے مرحلے میں جب تورات کے دعویدار اور قرآن کے حاملین ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں اور دونوں کو یہ دعویٰ ہو کہ ارض مقدس کے حقیقی وارث صرف وہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں طرف کے اہل تقویٰ جن کے دل خشیت الہی سے مامور ہوں، جو قومی اور سیاسی مفاد سے اوپر اٹھ کر محض رضائے الہی کے لئے کچھ سوچنے اور کرنے کا داعیہ رکھتے ہوں وہ آگے آئیں اور انسانی جانوں کے اتلاف کے اس طویل سلسلے پر اپنی اپنی مذہبی تعلیمات کی روشنی میں باہمی گفت و شنید کے لئے اساس فراہم کریں۔

جب سے ریاست اسرائیل قائم ہوئی ہے۔ یہودی علماء کی ایک بڑی تعداد اس کے قیام کو غیر توراتی بتاتی رہی ہے۔ ان کے یہاں مسیح کی آمد سے پہلے کسی ریاست کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ان کے ہاں ایسے مفکرین کی بھی کمی نہیں جو بڑی جرأت کے ساتھ اسرائیل کو ایک ایسی یہود دشمن حکومت بتاتے رہے ہیں جہاں تورات کی تعلیمات کی کھلے عام نفی کی جاتی ہے۔ فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کی جتنی شدت سے مخالفت خود یہودی علماء و مفکرین کے حلقے سے ہوتی رہی اتنی شاید باہر سے بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ اہل یہود کے ان خداترس علماء کی تحریروں کو پڑھئے اور قوم یہود میں ریاست اسرائیل کے مظالم کے خلاف جاری مختلف تحریکوں پر نظر ڈالئے تو یہ بات صاف محسوس ہوتی ہے کہ آج بھی ان کے یہاں ان شب بیدار اہل تقویٰ کی کمی نہیں، جن کی قرآن میں ستائش کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے حلقے سے بھی موجودہ دل گرفتہ صورت حال پر قومی نقطہ نظر کے بجائے قرآنی موقف اور مکمل قرآنی حل کو واضح گام انداز میں پیش کیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قومی نقطہ نظر سے ہمارا کیس خاصہ مضبوط ہے ہم وہ لوگ ہیں جن پر بزور بازو ایک ریاست تھوپ لی گئی اور ایک لامتناہی جنگ مسلط کر دی گئی۔ پھر اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فلسطین کا پر امن حل اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ غاصب یہودی واپس جائیں اور اسرائیل کا نام و نشان دنیا سے مٹ جائے تو

یقیناً اس موقف کے سلسلے میں ہم پر جانب داری کا الزام نہیں آئے گا۔ البتہ اس بات کو آخری صداقت سمجھنا دراصل فریق مخالف سے تمام گفت و شنید کی راہ بند کردے گا اور پھر ہمارے پاس مسئلہ کے حل میں وہی ہیجان انگیز بیانات سامنے آئیں گے جن پر گزشتہ پچاس برسوں سے کار بند ہونے کے باوجود ہم کسی حل کی طرف تو کیا پہنچتے البتہ اس سنگین انسانی مسئلہ کو چلتے چلاتے شاعرانہ انداز سے پنپانے کے خوگر ہو گئے ہیں۔ اگر ساری دنیا کے مسلمان اسرائیل پر ایک بالٹی پانی ڈال دیں تو اسرائیل کا وجود بہہ جائے یا اگر ساری دنیا کے مسلمان اسرائیل پر صرف تھوک دیں تو وہ اس تھوک میں دفن ہو جائے گا۔ یہ وہ شاعرانہ باتیں ہیں جو وقتی طور پر ہمارے خون میں گرمی تو ضرور پیدا کرتی ہیں البتہ ان کا قابل عمل ہونا خود کہنے والوں کے دل و دماغ پر واضح نہیں ہوتا۔

ایک طرف ایریل شیرون کی حکومت ہے جو ظلم و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ چکی ہے۔ حکومت کی پوری مشینری بدترین طرح کے کرپشن کا شکار ہے۔ خود ایریل شیرون اور ان کے اہل خانہ کا ریکارڈ ریاستی خزانے کے حوالے سے انتہائی داغ دار رہا ہے۔ دوسری طرف عرفات اور ان کے حواریوں کا ٹولہ ہے جس نے بے بس فلسطینیوں کے نام پر امدادی فنڈوں کا غتر بود کر رکھا ہے۔ نہ اسرائیل کے حکمرانوں کو مذہب یہود سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی عرفات کے پیش نظر ارض فلسطین میں کسی عادلانہ معاشرے کا قیام ہے، لیکن دونوں طرف جو لوگ جانیں دے رہے ہیں وہ خالص مذہبی جذبے سے سرشار ہیں۔ جو صدق دل سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شہادت ایک مذہبی فریضہ ہے۔ کیا شیرون اور عرفات کی حکومتوں کو برقرار رکھنے کے لئے یا مستقبل کی دو علیحدہ علیحدہ غیر توراتی اور غیر قرآنی ریاستوں کے قیام کے لئے دونوں طرف سے انسانی جانوں کے اتنے بڑے نذرانے کا کوئی جواز ہے؟

اسرائیلی ریاست اور فلسطینی اتھارٹی دونوں ہی اپنے غیر دینی بلکہ بڑی حد تک دین مخالف لب و لہجہ کے باوجود اگر شدت پسند مذہبی عناصر کی حمایت برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ہی طرف کی مذہبی قیادت، کہیں کم کہیں زیادہ مذہب کے نام پر تاریخ میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ ایک ایسی تاریخ جسے ماضی کی طرف ہمارے تقدیری رویے نے تقدس عطا کر رکھا ہے اور جس سے غایت دین کا کوئی واقعی تعلق نہیں۔ ضرور اس بات کی ہے کہ ہم محض ایک مسلم قومی نمائندے کی حیثیت سے مسئلہ کو دیکھنے کے بجائے دونوں نقطہ نظر کو انتہائی کھلے دل سے سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر کسی ایسی پے چیدہ صورت حال پر غایت قرآنی کی روشنی میں کسی قابل عمل حل تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ یہودی کہتے ہیں کہ ارض فلسطین

میں محض ان کا چار مربع فٹ چلنا انہیں جنت میں پہنچا سکتا ہے۔ ان اوہامی تصورات کے لئے خود ان کی تورات سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ ہاں تلمودی ادب میں ایسی بشارتوں کی کمی نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معبد کے بغیر ان کی مذہبی زندگی ادھوری ہے۔ ہیکل سلیمانی کی مرکزی قربان گاہ کے بغیر ان کے یہاں قربانی کا کوئی تصور نہیں۔ مذہبی یہودی جنہیں سیاسی قیادت نے یرغمال بنا رکھا ہے جو عرصے سے ارض کنعان کی واپسی کی دعا کرتے آئے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی دو ہزار سال بعد اب انہیں اتنی قوت فراہم ہوگئی ہے کہ وہ ہیکل سلیمانی کی مذہبی زندگی کو دوبارہ بحال کر سکتے ہیں۔ لہذا وہ اس تاریخی موقع کو ہرگز کھونا نہیں چاہتے۔ دوسری طرف فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم اور جبراً ان کی بے دخلی کا معاملہ بھی ایک ایسا روشن واقعہ ہے جس سے تاریخ اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ پھر یہ کہ قبلہ اول کے حوالے سے مسجد اقصیٰ اور گنبد صحرا کا معاملہ بھی مسلمانوں کے لئے ایک خالص مذہبی معاملہ ہے جس نے ارض فلسطین کو ان کے نزدیک بھی یہودیوں کی طرح ارض مقدس بنا دیا ہے۔ لہذا دونوں قومیں ارض مقدس پر کسی قسم کی مصالحت کو سودا بازی سے تعبیر کرتی ہیں۔ انور سادات اور اسحاق رابین کی اپنے ہی ہم قوموں کے ہاتھوں موت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دونوں جگہ اس بارے میں کتنی شدت پائی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے جس نے اس پوری معرکہ آرائی کو خون آشام بنانے میں مرکزی رول ادا کیا ہے۔

ایک ایسے مرحلے میں جب دونوں طرف شدت جذبات میں کسی منصفانہ اور معقول حل کے راستے بند دکھائی دیتے ہوں۔ جب ابراہیم کے ماننے والے، اسحق و اسمعیل کی صلیبی اور روحانی اولادیں اسی ایک خدا کی عبادت گاہ کے حوالے سے بدترین خون خرابے میں مبتلا ہوں اور جب توحید کے علمبردار یہ بھول گئے ہوں کہ خدا کو کسی خاص مسجد یا کسی طرز کے معبد کے بجائے غیر مشروط سپردگی مطلوب ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان حاملین قرآن کی حیثیت سے آگے آئیں اور لوگوں کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلانیں کہ اللہ کو جو کچھ مطلوب ہے وہ یہودی، عیسائی یا روایتی مسلمانیت نہیں اور نہ ہی کسی خاص شناخت کی طرز تعمیر اور ان میں ہونے والی فرقہ وارانہ عبادت۔ وہ تو ﴿کونوا ہودا او نصاری﴾ کو لائق استزاد سمجھتا ہے اور اس کا مطالبہ ﴿ملہ ابراہیم حنیفا﴾ کا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ براہمی سلسلے میں پائی جانے والی سعید روحیں ارض فلسطین کو اس موجودہ گرداب سے نکالنے کے لئے لوجہ اللہ آگے آئیں۔ حق کی حمایت میں وہ اس بات سے بے پروا ہو کر سوچیں کہ ان کی باتیں خود ان کی قوم کی ناراضی کا سبب بن جائے گی یا اس سے ان کے قومی مفاد کو نقصان پہونچے گا۔ گذشتہ دنوں جب اسرائیلی پارلیامان (Knesset) کے ایک

رکن ابراہیم برگ نے ریاست اسرائیل کو حقیقت پسندی کا مشورہ دیا تو یہودی دنیا میں انہیں دشمنوں کا معاون گردانا گیا۔ اہل یہود میں ابراہیم برگ جیسے لوگوں کی کمی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اہل یہود سے متعلق ہمارا فہم قرآن مجید کے بجائے سید قطب کے معروف زمانہ کتابچہ معرکتنا مع الیہود کا پروردہ ہے جس میں بلا تشکی تمام ہی یہود شیطانی گروہ کے پراسرار کردار کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں۔ ہم مدت سے ان تفسیروں کے اسیر ہیں جن میں ﴿غیر المغضوب علیہم ولا الضالین﴾ سے بالخصوص یہود و نصاریٰ مراد لئے جاتے ہیں۔ ہم شدت جذبات میں یہ نہیں سوچتے کہ قرآن مجید جو منصف اعلیٰ کا کلام ہے عہد رسول کے بعض یہودی قبائل یا افراد کی بدبختی کے لئے ان کی تمام آئندہ نسلوں پر لعنت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ قرآن میں اہل قریش کے بعض کردار کی بھی شدید مذمت کی گئی ہے۔ کفار قریش کی دنیوی و اخروی خسارے کا مژدہ سنائے جانے کے باوجود ہمارے گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ تاقیامت کفار قریش کی اولادیں مغضوب الغضب ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کسی خاص نسل کی شرارت کے لئے آنے والی تمام نسلوں کو باعث لعنت قرار دیا جائے۔ کچھ یہی معاملہ اہل یہود کی مذہبی فکر کا بھی ہے جو تلمودی تشریحات کے زیر اثر یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ اہل یہود کی برگزیدہ قوم کے مقابلے میں غیر یہود کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ان کا خون مباح اور ان کی ثقافت بے معنی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسئلہ فلسطین پر روایتی فہم کے بجائے ازسرنو غایت قرآنی کی روشنی میں غور و فکر کریں۔ تبھی ہم مسلسل تلف ہوتی ہوئی جانوں کو ضائع ہونے سے بچا سکیں گے اور فلسطین کی تاریخی سرزمین ماضی کی طرح مسلمانوں اور دیگر اہل کتاب کی عبادتوں سے معمور ہو سکے گی۔ کہاں گئے اہل کتاب کے وہ ائمہ قائمہ جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ راتوں کو اٹھتے اور خدا کی حمد و مناجات کرتے ہیں اور جن کے لئے قرآن کی بشارت ہے کہ ان کے نیک اعمال کی ناکدوری نہیں کی جائے گی ﴿وما یفعلوہ من خیر فلن یکفروہ﴾ لیکن ساتھ ہی ساتھ خود ہمارے اندر ایسے خدا ترس لوگوں کی دریافت ضروری ہے جو کمال جرأت کے ساتھ قومی مفاد سے اوپر اٹھ کر یہ کہہ سکیں ﴿یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ألا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا و لا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ﴾ (آل عمران: ۶۴)۔

(نوٹ: یہ تحریر یا سرعفات کے انتقال سے قبل لکھی گئی تھی)



ضرورت اس بات کی ہے کہ عقل و آگہی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کا رفیق و مددگار قرار دیا جائے۔ قدیم اسلامی تعبیرات کو ایسے منجمد عقائد (dogma) کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے جسے negotiate نہ کیا جاسکتا ہو۔ یہ کام خاصا آسان ہو جائے گا اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ ہمارے متقدمین جنہوں نے ماضی میں تشریح و تعبیر کا فریضہ انجام دیا ہے وہ بھی ہماری طرح انسان تھے جن سے لغزشوں اور التباسات کا صدور فطری ہے۔ ہم اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ دوسروں کے التباسات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔ ہمارے لئے ہمارے اپنے التباسات کا بوجھ ہی کیا کم ہے۔

بین المذاہب مکالمہ کے لئے ایک نئی دینیات کی ضرورت

خواتین و حضرات!

حضرت مسیحؑ ان چند برگزیدہ انبیاء میں سے ہیں جن کا تذکرہ بڑے ہی والہانہ انداز میں قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ قرآن مجید کی ایک مکمل سورت آپ کی والدہ حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام کے عنوان سے موسوم ہے جنہیں قرآن نے تمام مؤمن مردوں اور عورتوں کے لئے قدوہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ میں جب بھی سورۃ مریم کی تلاوت کرتا ہوں اس کے صوتی آہنگ، جملوں کے زیر و بم، اور مضامین کی رفعت سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے لئے مسیح کی شخصیت سے الگ ہو جانا ممکن نہیں۔ مسیح ابن مریمؑ ہمارے ہیں اور ہم اہل ایمان مسیح ابن مریم سے ہیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ آج تبعین محمد اور تبعین مسیح کے درمیان گہری خلیج حائل ہے۔ ہم نظری طور پر حضرت مسیح کو اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتے اور نہ ہی حضرت مسیح کے سچے تبعین سے اپنا رشتہ توڑ سکتے ہیں۔ حضرت مسیح پر ہمارا ایمان، خانوادۂ انبیاء کے دوسرے نبیوں کی طرح، ایمان کا جزو لا ینفک ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں اور حضرت مسیح کے مابین اس گہرے تعلق کا صحیح ادراک اب تک عیسائی دنیا میں نہیں کیا جاسکا ہے۔

میرے مسیحی بھائیو اور بہنو!

اہل ایمان کے گروہ جس طرح معاصر تاریخ میں بے وزن اور بے وقعت ہیں شاید انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آج جن لوگوں کے ہاتھوں میں دنیا کا اقتدار اعلیٰ ہے انہیں مذہبی اقدار

اور اعلیٰ انسانی اخلاق کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ بیسویں صدی جو ابھی گزری ہے انسانی ہلاکت، اجتماعی قبروں، منظم نسل کشی اور غیر انسانی نظریات کی ترسیل و اشاعت کے لئے کچھلی تمام صدیوں پر بازی لے گئی ہے۔ انسان انسانوں کے لئے بھیڑیا بن گیا ہے۔ جیس فیروز کی طرح ہم میں سے بہت سے لوگ اس بات پر ایمان لے آئے ہیں کہ تہذیب محض ظاہری حسن کا ری ہے، اسے کھر چپے تو انسانی بہیمیت اپنی اصلیت ظاہر کر دے گی۔ آج چونکہ بہیمیت کو گلوبلائزیشن کا کاندھا بھی فراہم ہو گیا ہے لہذا اب پوری دنیا بھیڑ نما انسانوں کی چراگاہ بن گئی ہے۔ امریکی صدر جارج بوش کے الفاظ میں there is no place to hide گویا جارج امریکی عزائم سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ کوئی جائے پناہ نہیں رہ گئی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ موجودہ دنیا کی سواری سے اترا آئیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کوئی متبادل موجود نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم لوہے کے ایک پنجرے میں قید ہوں جس کی دیواریں چار سمت سے ہم پر تنگ کی جارہی ہوں۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہے جو اس سے پہلے فرد کو کبھی پیش نہیں آئی۔ اس احساس کو صحیح نام دینے کے لئے ہماری لغت میں الفاظ موجود نہیں ہیں۔

صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر آج میں آپ سے بلا تکلف کہہ دیتا ہوں کہ ہم خواہ مذہبی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوں، ہم تمام لوگوں کا مستقبل اسی کرہ زمین کے مستقبل سے وابستہ ہے جسے خدا بیزار انسانی قیادت ہر اعتبار سے تباہ و برباد کرنے اور بالآخر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے درپے ہے۔ مختلف ممالک جو نیوکلیائی قوت بن چکے ہیں یا بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں دراصل ایک ایسی سمت کے مسافر ہیں جس کی اگلی منزل انہیں معلوم نہیں۔ قوموں کے خواب سراب زدہ اور گمراہ کن ہیں۔ جھوٹی عظمتوں نے انہیں اپنی ساری قوت ایسے مقاصد کے لئے وقف کر دینے پر مجبور کیا ہے جس میں انسانیت کے لئے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صورتحال اب انسانی ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔ جن بوتل سے باہر آ گیا ہے۔ ساحروں کو پتہ نہیں کہ اسے دوبارہ بوتل میں واپس کیسے بھیجا جاسکتا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ ہم صورتحال کا صحیح ادراک کرنے سے قاصر ہیں کہ ہماری آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو ذرائع ابلاغ دکھاتے ہیں اور چونکہ ذرائع ابلاغ پر انہی غاصب قوتوں کا پیرہ ہے اس لئے عام انسان صورتحال کی سنگینی کا واقعی اندازہ نہیں کر پا رہا ہے۔ ایک ایسی صورتحال میں جب دنیا پر تاریکی نے اپنے پنچے گاڑ دیئے ہوں، جب سرنگ کی دوسری طرف روشنی نظر نہ آتی ہو اور جب مختلف تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید رو حیں خود کو بے بس محسوس کرتی ہوں اور جب اس صورتحال سے پریشان ہو کر پوری دنیا، بالخصوص عیسائی معاشروں میں برملا یہ سوال کیا

جانے لگا ہو کہ کہاں گئے وہ لوگ جنہیں حضرت مسیح نے زمین کا نمک اور دنیا کی روشنی کہا تھا اور جن سے یہ توقع تھی کہ ان تاریک ایام میں وہ دنیا کی رہنمائی کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی نہ صرف چرچ کی اس مجلس میں بلکہ عیسائی دنیا کے مختلف ایوانوں میں مسیح کے سچے متبعین کے کانوں میں یہ صدا آرہی ہوگی۔

”یقین جانو تم زمین کے نمک ہو اور اگر نمک اپنی نمکینیت کھودے تو پھر اسے کون نمکین کر سکے گا... تم تمام اقوام کے لئے مینارہ نور ہو۔ ایک ایسا چراغ جو پہاڑی پر واقع ہو۔ جس کی روشنی میں ہر کوئی راستہ پاسکے۔ اپنی روشنی پر پردہ نہ ڈالو، اپنی روشنی سے ساری دنیا کو منور کر دو، تمہاری روشنی سمجھوں کے لئے مفید ثابت ہوتا کہ سب لوگ تمہارے آسمانی باپ کی نعمت سرائی کر سکیں“۔ (متی ۵ آیات ۱۳ تا ۱۶)

مجھے یہ بات کہتے ہوئے بڑا قلق ہو رہا ہے کہ جو لوگ کبھی دنیا کے لئے مینارہ نور تھے اب موجودہ تاریکی میں اپنے اس فرض منصبی کو انجام نہیں دے رہے ہیں۔ ہمیں یہ تو نہیں کہنا کہ پوری عیسائی دنیا ظلمت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بگاڑے ہوئے ہمیں روشنی کے کچھ مناظر دکھائی دے جاتے ہوں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ فی زمانہ متبعین مسیح کی حیثیت مینارہ نور کی نہیں رہ گئی ہے در نہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود کو ظلمت میں اس طرح گھرا پاتے۔ آج کی اس مجلس میں میں نے قدرے بے تکلفی سے کام لیا ہے ایسا اس لئے کہ میں خود کو ان کے درمیان پاتا ہوں جنہیں زمین کے نمک اور مینارہ نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم مسلمانوں نے متبعین مسیح کو ہمیشہ اہل کتاب سے خطاب کیا ہے یعنی ایک ایسا طائفہ جو خدا کے سچے رسول کی پیروی کا دعویدار ہو اور جسے ایمان و انصاف کے حوالے سے قائل کیا جاسکتا ہو۔ قرآن مجید ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہم اہل کتاب کے ساتھ مشترکہ محاذ ترتیب دیں اور وہ باتیں جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں ان کی بنیادوں پر مشترکہ جدوجہد کا پروگرام بنائیں۔ بالفاظ دیگر مجھے کہنے دیجئے کہ متبعین مسیح اور متبعین محمد کے لئے مشترکہ جدوجہد کی بنا ہمارے نزدیک نہ صرف یہ کہ قابل قبول ہے بلکہ قرآن مجید اس کا داعی بھی ہے۔ البتہ اس حقیقت کے اظہار میں مجھے تکلف نہیں برتنا چاہئے کہ ﴿یَا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء﴾ کی دعوت ماضی میں بعض سیاسی وجوہ کے سبب اس طرح نہیں برتی جاسکی ہے جیسا کہ اس کا حق تھا۔ آئیے میں ذرا اس بات کی وضاحت کروں۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں جب خدا کا آخری رسول ہمارے درمیان موجود تھا ہم مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح تھی کہ انسانی تاریخ میں متبعین محمد ایک خاص مقام پر فائز ہیں۔ یہودی اور عیسائی قوموں کے بعد انسانی تاریخ کی رہنمائی کی ذمہ داری ہمیں سونپی گئی ہے۔ قرآن نے بہت واضح الفاظ میں ہمیں بتایا

ہے کہ محمد رسول اللہ کی دعوت بعینہ وہی دعوت ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء کے ذریعہ انسانوں کی طرف بھیجی گئی بلکہ قرآن نے تو اس بات کی صریح الفاظ میں وضاحت کی ہے کہ محمد رسول اللہ دین براہیمی کے احیاء کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ وہی ابراہیمؑ جسے قرآن مسلم حنیف کے لئے رول ماڈل کے طور پر پیش کرتا ہے اور جس کے سچے متبعین کے لئے کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا مطالعہ یقیناً آپ کے لئے باعث دل چسپی ہوگا۔ ﴿رَبَّنَا واجعلنا مسلمین لك ومن ذریتنا امة مسلمة لك و ارنا مناسکنا و تب علینا انك انت التواب الرحیم﴾ (البقرة: ۱۲۸) ابراہیمؑ کی دعا قبول ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی اولاد سے انبیاء کا ایک سلسلہ جاری ہوا یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں محمدؐ رسول اللہ پر تمام ہوا۔ انبیاء کا یہ خانوادہ جس میں ابراہیمؑ و اسحاقؑ اسماعیلؑ و یعقوبؑ و سلیمانؑ و داؤدؑ سبھی شامل ہیں، قرآن کہتا ہے، خدا کے سچے متبعین کی جگہ گاتی کہکشاں ہے۔ ہم مسلمان ان تمام انبیاء پر ایمان لانا لازم خیال کرتے ہیں۔ ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے ﴿لانفرق بین احد منهم﴾۔ یہ سب کے سب ہمارے لئے قابل اتباع ہیں پھر ہم ان کے سچے متبعین اور ان سے اپنا رشتہ جوڑنے والوں سے محبت ترک کر دیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ہم نے کبھی غیر نہ سمجھا۔ قرآن ایسے لوگوں کی مدح و ستائش کرتا ہے جن کا تعلق اہل یہود اور اہل نصاریٰ سے ہے۔ ایسا اس لئے کہ ان میں سے بعضوں کی پیشانیاں سجدے سے معمور اور ان کے دل خشیت الہی سے لبریز ہیں۔ قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ ہمیں مشترکہ جہد و عمل کی بنیاد فراہم کی ہے بلکہ اس نے ہمیں اہل کتاب سے سماجی اور معاشرتی رشتوں کی بھی اجازت دی ہے۔ اہل کتاب کا کھانا ہمارے لئے حلال کیا گیا اور ہمیں اس بات کی اجازت دی گئی کہ ہم ان کی عورتوں سے رشتہ مناکحت استوار کریں۔ قرآن کی پیدا کردہ یہی وہ وسعت قلبی تھی کہ جب عہد رسولؐ میں نجران کے عیسائیوں کا ایک قافلہ مدینہ پہنچا تو رسول اللہؐ اس وفد کے ساتھ بڑی الفت و محبت سے پیش آئے، باوجود اس امر کہ انہیں اپنے عیسائی بنے رہنے پر اصرار تھا۔ ہم مسلمانوں کے دل ہمیشہ سے حضرت مسیحؑ کے سچے متبعین کے لئے کھلے رہے ہیں اور حضرت مسیحؑ کے سچے متبعین بھی ہمارے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آئے ہیں۔ ذرا اس حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی مثال ملاحظہ فرمائیے جس نے مسلمانوں کو سیاسی پناہ دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نجاشی کی موت کی خبر جب مدینہ پہنچی تو رسول اللہؐ کو بڑا قلق ہوا آپ نے اس کے لئے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ آپ نے کہا لوگو! آج تمہارا ایک بھائی رخصت ہو گیا ہے اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ مسلمانوں کی پہلی

نسل خود کو عیسائیوں سے کتنا قریب سمجھتی تھی اس کا اظہار قرآن کی ان آیات سے ہوتا ہے جن میں ایرانیوں کے ہاتھوں رومی عیسائیوں کی شکست پر قرآن نے مسلمانوں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا ہے کہ جلد ہی اہل ایمان کو اس صدمے کے ازالہ کی خوشخبری ملے گی جب رومی عیسائی کے ہاتھوں ایرانی لشکر شکست پائے گا۔

حتیٰ کہ ان ایام میں جب اسلامی تحریک پر خطرات کے بادل منڈلا رہے تھے اور جب یہود و نصاریٰ سے مسلمانوں کو متوقع تعاون ملنے کے بجائے ان کی طرف سے مسلسل مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا سامنا تھا ان حالات میں بھی اہل کتاب کے سلسلے میں مسلم فکر کو مجروح نہیں ہونے دیا گیا، ہماری وسعت قلبی بدستور باقی رہی۔ رسول اللہ انہیں اہل کتاب قرار دیتے رہے اور قرآن اس بات کا برملا اعلان کرتا رہا کہ ﴿لَیْسُوا سِوَاہُمْ مِنْ اَہْلِ الْکِتَابِ اِنَّ قَائِمَةَ یَتْلُوْنَ آیَاتِ اللّٰہِ اَنَاءَ اللَّیْلِ وَہُمْ یَسْجُدُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۱۳) اور یہ کہ ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوسٰی اُمَّةٌ یَّہْدُوْنَ بِالْحَقِّ﴾ (الأعراف: ۵۹)۔ رہی عیسائیوں کی بات تو عیسائیوں کے سلسلے میں ہم نے ہمیشہ تعلق خاص کا اظہار کیا ہے۔ بقول قرآن ”تم اہل ایمان سے محبت میں ان لوگوں کو قریب پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے درمیان علماء، اور عبادت گزار افراد پائے جاتے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ وہ تکبر نہیں کرتے“ (مائدہ: ۸۲)۔

قرآن نے چونکہ اہل کتاب کو ایسے گروہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے جو مسلمانوں ہی کی طرح خدا کی اتباع کو اپنی قومی زندگی کے لئے سبب افتخار قرار دیتا ہے اس لئے مسلمانوں نے ہمیشہ سے اہل کتاب کی طرح احترام و رواداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسلم ریاستوں میں انہیں اعلیٰ مناصب دیا جانا اور انہیں مذہبی آزادی کی ضمانت اسی بات پر دال ہے۔ اسلامی ریاست اہل کتاب کے حقوق کے سلسلے میں اتنے حزم و احتیاط کا مظاہرہ کرتی رہی ہے کہ جب حضرت عمر فاتح کی حیثیت سے یروشلیم میں داخل ہوئے تو صرف اس خیال سے آپ نے چرچ کے اندر نماز پڑھنا مناسب خیال نہ کیا کہ مبادا ان کا یہ عمل مسلمانوں کے لئے چرچ کو مسجد میں تبدیل کرنے کا سبب بن جائے۔ حتیٰ کہ چرچ کے باہر جن سیڑھیوں پر آپ نے نماز ادا کی اس بارے میں بھی آپ نے یہ تحریری ضمانت دینا ضروری سمجھا کہ مسلمان صلوٰۃ عمر کو نظیر بناتے ہوئے اس جگہ کو مسجد میں تبدیل نہ کر دیں۔

رہی یہ بات کہ اہل کتاب کے معابد تو اس بارے میں اگر مسلمانوں نے احترام و رواداری کا مظاہرہ کیا ہے تو اس کی بنیاد بھی قرآن میں موجود ہے۔ بالفاظ قرآن ﴿وَلَوْ لَا دَفَعَ اللّٰہُ النَّاسَ بَعْضُہُمْ بَعْضًا لَّفُتِنَتْ اَیُّوہُمْ اَنْ یَّعْبُدُوْا اِلٰہًا سِوَا اللّٰہِ کَثِیْرًا﴾ اگر اللہ لوگوں کو ایک

دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹا تا رہتا تو یہ خانقاہیں چرچ، سنا گاؤگ اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے ڈھادی جاتیں (الحج: ۴۰)۔ مسجدوں کے ساتھ ساتھ خانقاہوں چرچ اور سنا گاؤگ کا تذکرہ اور پھر یہ کہنا کہ ان میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے اس بات پر دال ہے کہ مسلمانوں کو اہل کتاب کے معابد کو بنظر احترام دیکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ابتدائی ایام میں مسلم ذہن پر یہ حقیقت روشن تھی کہ ان کی دعوت تمام انبیاء کی دعوتوں کا ارتکاز ہے۔ ان سے پہلے جو لوگ کتابوں کے حاملین رہے ہیں۔ انہوں نے بھی دنیا کو بندگی رب کی دعوت دی ہے۔ اب چونکہ آخری نبی کی حیثیت سے مسلمان منصب سیادت پر فائز ہیں اس لئے دنیا کے تمام اہل ایمان کی کمانڈ ان کے ہاتھوں میں ہے جب تک مسلمان خود کو اس منصب عظیم کا حامل سمجھتے رہے وہ اہل کتاب کی قوتوں کو کلمۃ سواء کی بنیاد پر عظیم نبوی مشن کے لئے استعمال کرتے رہے۔ البتہ جب سے انہوں نے بعض سیاسی اور معاشی عوامل کے تحت خود کو امت مامور کے بجائے اہل کتاب ہی کی طرح ایک عام امت سمجھنے لگے، ان کی وسیع النظری اور رواداری کو گہن لگ گیا۔ ہمارے علماء و فقہاء اہل کتاب کے سلسلے میں تحفظ ذہنی کے اسیر ہو گئے اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا گویا کلمۃ سواء کے مشترکہ پروگرام میں اب اہل کتاب کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب عباسی بغداد میں بعض اہل یہود کو کلیدی عہدے عطا کئے جانے لگے تو اس صورت حال نے مسلمانوں میں قومی طرز فکر رکھنے والوں کو اندیشوں میں مبتلا کر دیا۔ اموی دور حکومت ہی سے کلیدی مناصب کی تقسیم میں قبائلی عصبیت کا رفرما ہو گئی تھی۔ لوگ اس بات کو حق بجانب سمجھنے لگے تھے کہ اعلیٰ عہدوں پر تقرری میں خاندانی تعلقات اور قومی شناخت کو بھی مد نظر رکھا جائے۔ دوسری طرف اہل یہود کے بعض خاندان بعض انتظامی اور معاشی علوم میں اپنی سبقت کی وجہ سے خصوصی امتیاز کے حامل تھے۔ جس کی وجہ سے حکومت کی نگاہ انتخاب ان پر پڑ رہی تھی۔ اسی عہد میں قومی مسلمانوں کی طرف سے بعض ایسی روایتیں وضع کی گئیں جن سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اہل کتاب کو اسلامی ریاست میں اہم مناصب عطا نہیں کئے جاسکتے۔ کہا جاتا ہے کہ بنو قریظہ کے قتل کا قصہ جو بعد کے عہد میں سیرت کی کتابوں میں تواثر کے ساتھ نقل ہوا ہے، ابن اسحاق اور دوسرے مؤرخین کے ہاتھوں اسی عہد میں تشکیل پایا ہے۔ ہمارے عہد میں بعض ایسی تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں جس نے اس واقعہ کے سلسلے میں سخت شبہات پیدا کر دیئے ہیں۔ نبی رحمت کے ہاتھوں کسی قبیلہ کے اجتماعی قتل عام کو نہ صرف یہ کہ ذہن قبول نہیں کرتا بلکہ تاریخ بھی اس کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ ان تراشیدہ قصوں کے اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ اہل کتاب کے سلسلے میں عہد عباسی

میں ہمارے فقہاء و مفکرین کے نظریے بدلنے لگے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کفار کی طرح اہل کتاب کو بھی، جنہیں اب تک ہم قرآنی دائرہ فکر میں ایمانی گروہ سمجھتے رہے تھے، صاغرون بن کر رہنا ہوگا۔

اہل کتاب اور دوسرے گروہوں کی طرف ہماری وسعت قلبی کے خاتمہ نے ہمیں ایک قومی امت کے حصار میں محصور کر دیا اور ہم جواب تک تمام نوع انسانی کے لئے انصاف مساوات اور حریت کے حصول کو اپنا مقصد قرار دیتے تھے اب ان عظیم مقاصد کو ہم نے صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص کر دیا۔ اہل کتاب کے سلسلے میں ہمارے اس نئے رویے کی تشکیل میں بنو قریظہ سے متعلق تراشیدہ قصے اور معاہدہ عمر کے مفروضہ دستاویز نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ہمارے مفکرین نے اس بات پر غور کرنے کی ضرورت کم ہی سمجھی کہ بنو قریظہ کا مفروضہ واقعہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے بنیادی اصولوں سے ٹکراتا ہے بلکہ خود اس واقعہ کے بیان میں اتنے تضاد موجود ہیں کہ اس کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ دوسری طرف معاہدہ عمر کے مختلف متن تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ ہر متن ایک دوسرے پر اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس دستاویز کو حضرت عمر جیسی جلیل القدر شخصیت سے منسوب کرنا مناسب نہیں اور نہ ہی کسی ایسے مشکوک دستاویز کی بنیاد پر اہل کتاب کے سلسلے میں ایک ایسا نقطہ نظر تشکیل دیا جاسکتا ہے جو انہیں حلیف کے بجائے حریف کے طور پر پیش کرے۔ افسوس اہل کتاب کے سلسلے میں عہد عباسی میں ہمارے رویہ نے جو کروٹ لی اس کی بنیادیں قرآن کے بجائے اس تاریخ میں ہے جس کی سند مشکوک ہے۔ مجھے اس بات کو بھی تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ خلافت علی منہاج النبوة جب اپنی اصل بنیادوں سے ہٹ کر ملوکیت کی راہ پر گامزن ہو گئی تو اس دور میں ہم نے اسلام کی اشاعت کے بجائے مسلم قومی افتخار کا علم بلند کرنا ضروری سمجھا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کتاب سے ہمارے رشتوں کی دینی بنیاد نہ صرف یہ کہ متاثر ہوئی بلکہ ہم انہیں قومی افتخار کے پروجیکٹ میں رکاوٹ کے طور پر دیکھنے لگے۔ اب چونکہ نہ ہم اس انبیائی مشن کے حامل تھے اور نہ ہی اہل کتاب کو اپنا حلیف بنانے کی ضرورت سمجھتے تھے اس لئے فقہاء اسلام نے آگے چل کر ان کے ساتھ سماجی رابطوں کے سلسلے کو منقطع کرنے کی کوشش کی۔ کتابیہ عورت سے نکاح کو معیوب سمجھا جانے لگا۔ ہمارے مفکرین یہ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کی قومی ریاست اسلام کے بجائے عرب عصبيت سے قوت حاصل کر سکتی ہے اور یہی اس کے لئے نقطہ اتحاد ہو سکتا ہے۔ اسلام سے عرب عصبيت تک کے اس سفر نے مسلم ذہن کو ایک بڑے بحران سے دوچار کر دیا۔ جلد ہی دنیا نے دیکھا کہ مسلمان اور نصاریٰ جو کبھی فطری حلیف تھے، دو سو سالوں تک مسلسل ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے۔ صلیبی جنگوں نے

نہ صرف یہ کہ عیسائی مسلم تعلقات کی دینی بنیادیں ہلا دیں بلکہ آنے والی صدیوں میں مسلمانوں کے سلسلے میں عیسائی نقطہ نظر کی تشکیل میں ان جنگوں نے کلیدی رول ادا کیا۔ پروپیگنڈہ اتنا شدید تھا کہ یورپ میں صدیوں محمد رسول اللہ کو جھوٹے پیغمبر اور بہروپیے (نعوذ باللہ) کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی تک لندن کے اسٹیج ڈراموں میں محمد رسول اللہ کو ایک ایسے شخص کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا جو بقول ان ڈراموں کے پوپ بننا چاہتا تھا لیکن جب ان کی خواہش پوری نہ ہوئی تو انہوں نے عیسائیت کے خلاف ایک نیا مذہب ایجاد کر ڈالا۔ شکلیپر کے ڈراموں میں foul fiend Mahu کی گونج اور دانستے کی ڈوائن کامیڈی میں رسول اللہ کو جہنم کے مرکزی حصے میں دکھایا جانا اس مخالفانہ پروپیگنڈہ کی بین مثال ہے۔ اسلام کے خلاف اس متعصبانہ پروپیگنڈہ نے یورپ کے ادب کو جس طرح متاثر کیا ہے آج مغربی ذہن پر اس کے اثرات پڑ رہے ہیں کچھ یہی حال ہمارے علماء کی ان تحریروں کا ہے جو صلیبی جنگوں کے تناظر میں اہل نصاریٰ کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس قدیم فقہی مکالمہ کا صلیبی جنگوں سے اوپر اٹھ کر جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ یہ قدیم فقہی محاکمہ قرآنی دائرہ فکر کی پوری پاسداری کرتے ہیں یا نہیں گویا دونوں طرف فقہی اور مذہبی ادب کے بے لاگ محاکمہ کی ضرورت ہے اگر مسلمانوں کو ایک طرف اہل کتاب کے سلسلے میں فقہی مباحث کو قرآنی دائرہ فکر میں از سر نو تشکیل دینے کی ضرورت ہے تو دوسری طرف عیسائی علماء پر بھی لازم ہوگا کہ وہ بائبل میں موجود حضرت مسیح کے خطبوں کی روشنی میں اسلامی مشن کا صحیح اور منصفانہ محاکمہ کریں گویا دونوں طرف ایک نئی دینیات تشکیل دیئے بغیر مسلمان اور اہل کتاب پھر سے فطری حلیف نہیں بن سکتے ہیں۔ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ دنیا میں مختلف شعوب و قبائل کا پایا جانا اور مختلف انبیاء کے ایمانی طائفے دراصل خدائی اسکیم کا حصہ ہیں۔ خدا نے ہمیں مختلف اقوام و ملل میں پیدا کیا ہے اور مختلف ایمانی سلسلوں میں ہماری شناخت تشکیل دی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم مختلف ایمانی حوالوں سے جانے جائیں۔ ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ (الشوری: ۸) ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں لیکن اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ ہر گروہ نجات کو صرف اپنے لئے مخصوص سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ان نازک امور پر گفتگو سے قرآن اور بائبل دونوں جگہ منع کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُم يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ اور مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات بائبل کے فرمان thou shall not judge سے بھی واقف ہوں گے۔ جب خدا نے نجات کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اہل ایمان کے طائفہ کو



امت مسلمہ کا تمام تر انحراف اور اس کے زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے قرآن مجید کے ارد گرد تاویلات کا حصار کھڑا کر رکھا ہے۔ ہم کسی مسئلے پر قرآن مجید کو بولنے ہی نہیں دیتے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسئلہ مذکورہ پر ہمارے مکتبہ فکر کے فقہاء نے کیا لکھا ہے۔ رہے وہ مسائل جن کا بیان ان کتب میں نہیں پایا جاتا تو ہم ہر نئی چیز کی اس وقت تک مزاحمت کرتے ہیں جب تک وہ رائج ہو کر ہمیں خود اپنے حصار میں لے لے۔ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے لے کر مشینی ذبیحے تک ہمارے علماء نے پہلے تو ہر چیز کو حرام قرار دیا پھر رفتہ رفتہ وہی حرام اتنا پسندیدہ ہو گیا کہ اب مانگ کے بغیر کوئی مولوی تقریر کرنا پسند نہیں کرتا۔

اسلام میں اصلاحی تحریک کی معنویت

فی زمانہ مکہ سے واشنگٹن تک اسلام کی تجدید و اصلاح کا غلغلہ ہے گو کہ اسلام میں اصلاحی تحریک کا تصور کوئی اجنبی خیال نہیں ہے۔ البتہ اصلاح کے جو شدید داعیات اس وقت پائے جاتے ہیں شاید ایسی شدت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی اور اس حقیقت کے باوجود کہ اسلام میں تجدید و اصلاح کی نظری اساس پائی جاتی ہے آج اسلام کو اندر سے بدلنے کے لئے جو خارجی عوامل کام کر رہے ہیں اس نے اس کی تجدید و اصلاح کی ہر مخلصانہ کوشش کو شبہات کے دائرے میں داخل کر دیا ہے۔ مزید برآں مغرب میں جو دانشور اس وقت اصلاح کے علمبردار ہیں ان کا اصل ہدف اسلام کو عصری تناظر سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے یہ ہے کہ اسلام کو کس طرح قابو میں کیا جائے تاکہ ایک ایسے اسلام کی تشکیل ممکن ہو جو مغرب کے liberal frame work میں فٹ آسکے۔ مغرب نے اس سے پہلے عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ اسی نہج پر کامیاب تجربات کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اہل یہود اور اہل کلیسا کی طرح مسلمان بھی مغرب کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام سے خود کو ہم آہنگ کر سکیں تو مغرب کے لئے اس کے سب سے خطرناک مفروضہ دشمن اسلام سے بزور بازو نمٹنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔

تحریک اصلاح کے علمبرداروں میں ایک طبقہ ان مسلم دانشوروں پر مشتمل ہے جن کی تعلیم و تربیت مغربی دانش گاہوں میں ہوئی ہے۔ مسلمان مصلحین کی یہ نسل خود کو ابن حزم، داؤد ظاہری، ابن تیمیہ، ابو حامد غزالی، محمد بن عبدالوہاب، شاہ ولی اللہ اور ان جیسے دیگر مصلحین کا توسیع سمجھتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر ماضی میں مسلمان تحریک تجدید و اصلاح کا والہانہ استقبال کرتے آئے ہیں اور ان دلوں میں اپنے مصلحین کے لئے تھسین کے جذبات پائے جاتے رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جب آج اس تجدیدی عمل کی پہلے سے

کہیں زیادہ ضرورت ہے ہم اصلاحی تحریک پر اعتراض وارد کریں۔ البتہ ماضی کی طرح یہ سوال ابھی تک حل طلب ہے اگر ماضی کی اصلاحی تحریکیں اسلام کو اس کے اصل قالب تک لوٹانے میں ناکام رہی ہیں اور اگر ماضی میں تجدید و اصلاح کی کوششیں امت مسلمہ پر ایک نئی صبح طلوع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اجتہاد کی یہ سعی بلیغ آج با مراد ہو سکے گی۔ گزشتہ کئی صدیوں سے مسلم مصلحین کتاب و سنت کی طرف واپسی کی صدا لگاتے رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صدیوں کی ان شب و روز جدوجہد کے باوجود رجوع الی الکتاب والسنۃ کا خواب ہنوز ابھی شرمندہ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہمیں اس بات پر اپنی توجہ مرکوز کرنا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے بہترین دماغ اور مخلصانہ جدوجہد رجوع الی القرآن کے ہدف کو حاصل کرنے میں ناکام رہی گویا عہد جدید کے مصلحین پر دوہری ذمہ داری آپڑی ہے۔ اولاً انہیں کمالِ شرف نگاہی سے اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ متقدمین کی ناکامیوں کی بنیادی وجوہات کیا تھیں۔ ثانیاً انہیں ساتھ ہی اس بات کا التزام بھی کرنا ہے کہ فی زمانہ رجوع الی القرآن کی کامیاب کوششوں کے لئے کس طریقہ کار کا اختیار کرنا مناسب ہوگا اور یہ کہ کس طرح ایک بار پھر اسلام کی حقیقی روح ہم پر منکشف ہو سکے گی۔ گویا جدید مصلحین کو ابتداء ہی سے اس بات کا التزام کرنا ہوگا کہ وہ تاریخی اسلام اور نظری اسلام میں نہ صرف یہ کہ امتیاز کریں بلکہ مطالعہ قرآنی میں ایک ایسے منہج کی داغ بیل ڈالیں جس کے ذریعہ انسانی تعبیرات اور التباسات کے پردوں کا چاک کیا جانا ممکن ہو۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے جب ہر مسئلہ کو از سر نو تحقیق و تجربہ کا موضوع بنایا جائے اور ہر مسئلہ پر قرآنی دائرہ فکر میں از سر نو گفتگو کا آغاز ہو۔ یقیناً جانئے اگر ہم قرآن مجید کو حکم مانتے ہوئے اپنے تہذیبی اور علمی ورثے کا ناقدانہ جائزہ لینے کی جرأت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم خود کو فکری طور پر نزولِ وحی کے ان ایام میں پائیں گے جب وحی کی ضیا پاشیاں ہمارے قلب و نظر کو منور اور ہمارے ملی وجود کو طمانیت سے سرشار رکھتی تھیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے اعترافِ حقیقت کے طور پر اور آزادانہ غور و فکر کی راہ ہموار کرنے کے لئے ہمیں یہ کہہ لینے دیجئے کہ ماضی میں اصلاحی تحریکیں اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود اگر اسلام کے اس نظری ماڈل کی بازیافت میں کامیاب نہ ہو سکیں یا اپنی تمام تر خواہشوں کے باوجود عہدِ رسول کے Spatial ماحول میں ان کی واپسی ممکن نہ ہو سکی تو اسکی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مصلحین عہدِ رسول میں واپسی بطریقِ مسلکِ فقہی چاہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس سدِ تاریخ کو عبور کرنے کے لئے تیار نہ تھا جو حنفی، شافعی یا دوسرے فقہی فکر کے ارتقاء نے ان کے سامنے کھڑی کر دی تھیں۔ اقبال جیسا صاحبِ بصیرت جو قرآنِ مجید

کے گہرے مطالعے کی وجہ سے بلاشبہ منصب اجتہاد پر فائز تھا خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہے کہ وہ عادتاً حنفی ہے گویا بخاطر سہولت انہوں نے حنفیت کا دامن تھام رکھا ہے۔ کچھ یہی حال ان تمام مفسرین اور ائمہ اصلاح کا بھی ہے جو تمام عمر دین مبین کی شخصی تعبیر سے اپنا دامن چھڑانے کے باوجود خود کو کسی نہ کسی فقہی خیمے کا توسیع بتاتے رہے ہیں۔ جب یہ خیال عام ہو چکا ہو کہ چار فقہی مکاتب سے ماوراء اہل سنت والجماعت کے ہاں دین مبین کی کوئی مستند تعبیر ممکن نہیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس فقہی سد تارخ کو عبور کرتے ہوئے کوئی مصلح قرآن کے واقعی دائرہ فکر میں واپسی کا ہدف حاصل کر پاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رجوع الی القرآن کی تمام تر تحریکیں قرآنی دائرہ فکر میں واپسی کے بجائے متعلقہ فقہی خیموں کی توسیع اور اس کے استحکام پر منتج ہوئیں جس کی وجہ سے وحی ربانی کی اصل آب و تاب کے ساتھ بازیافت ممکن نہ ہو سکی۔

اس میں شبہ نہیں کہ فی زمانہ ماضی کے مقابلے میں تحریک اصلاح کے لئے کسی واقعی کامیابی کے امکانات کہیں زیادہ ہیں۔ اولاً امت کے علماء و دانشوروں پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ فکر و نظر کے قدیم فقہی زاویے جدید دنیا کا محاکمہ نہیں کر سکتے۔ ثانیاً تجدید و احیائے اسلام کی تحریکیں اپنی تمام تر والہانہ سرگرمیوں کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں اور یہ کہ اس طرز عمل کو مزید طول دینا مستقبل میں بھی کسی کامیابی کی ضمانت نہیں بن سکتا۔ ثالثاً یہ بات اب ہر خاص و عام پر واضح ہوتی جا رہی ہے کہ انٹرنیٹ کے عہد میں اب کوئی isolationist طریقہ کار کامیاب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ اس سکڑتی دنیا میں کوئی بھی مذہبی گروپ صرف اپنی نجات کے لئے ارد گرد سے بے تعلق ہو کر کوئی قابل عمل طرز زندگی تشکیل دے سکے۔ رابعاً اہل فکر کے حلقوں میں یہ خیال اب رفتہ رفتہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ مسلم فکر جو مختلف تاریخی مراحل طے کرتے ہوئے مختلف شارحین کی مداخلت اور تعبیرات کے نتیجے میں موجودہ مروجہ شکل میں سامنے آئی ہے اس میں وحی کی تجلیاں اب اس روایتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہیں۔ اس لئے مسلم فکر میں انسانی تعبیراتی عناصر کی نشاندہی اب ضروری ہو گئی ہے۔ تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وحی جیسے نتائج تعبیرات وحی سے حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ خامساً ایک borderless world کے وجود میں آجانے سے پہلی بار یہ احساس عام ہوا ہے کہ اقوام عالم کی امامت پر فائز امت اور رحمۃ للعالمین کے قبیعین آج ایک all-embracing وسعت کے بجائے اپنے دل و دماغ کو فرقہ وارانہ طرز فکر کا اسیر پاتے ہیں۔ ان کے ایجنڈے میں امت محمدیہ کی نجات اور اس کی فلاح و بہبود کی باتیں اتنی عام ہیں کہ غیر اقوام ان کی باتوں میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتیں۔ گویا عرصے سے وہ مفروضہ دارالاسلام میں محصور فلاح امت

کے منصوبوں میں اتنے مشغول رہے کہ رحمۃ للعالمین کا عنصر ان کی شخصیت سے یکسر محو ہو گیا ہے۔ بے لوث پیہر نہ صدا کی تلاش اور دکھے دلوں کی مسیحائی کے لئے عام انسانوں کی نگاہیں اب ان کی طرف نہیں اٹھتیں۔ یہ ایک ایسا قلق ہے جس کی چھن اہل فکر مسلمان شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ گویا ماضی کے مقابلے میں آج وحی ربانی کی بازیافت کے امکانات پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ البتہ وحی ربانی کی بازیافت کے لئے کسی منہج کے تعین کے سلسلے میں ہنوز خوفناک سٹائٹا طاری ہے۔ خطرہ ہے مبادا ایسا نہ ہو کہ دائرہ فکر قرآنی میں واپسی کا یہ زریں موقع بھی گنوا دیا جائے اور عالم انسانیت مزید چند صدیوں کے لئے آخری وحی کی تجلیوں سے محروم رہ جائے۔

تحریک تجدید و اصلاح کا مجوزہ منہج

تحریک اصلاح کا ہدف اسلام میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں بلکہ ان انسانی تعبیرات کا محاکمہ ہے جو اپنے تاریخی اور مکانی تناظر کے غیاب کی وجہ سے اب فرسودہ معلوم ہوتی ہیں۔ جدید مصلحین کے دل و دماغ پر یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ ان کا کام انسانی تعبیرات کے التباسات سے اپنا دامن بچانا ہے۔ وہ اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ نص قرآنی میں تغیر و تبدل کی سفارش کریں۔ ساتھ ہی ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ قدیم تعبیرات، اس کی تراش و خراش اور اس کے حصار سے باہر آنے کی کوشش اگر سابقہ انداز سے ہی جاری رکھی گئی تو نئی تحریک اصلاح کے نتائج بھی ماضی کے ناکام تجربوں سے مختلف نہ ہوں گے۔ گویا نئی تحریک اصلاح ابتداء سے انتہا تک ایک نئے لب و لہجے اور منہج کی حامل ہوگی جس کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ ماضی کی تمام جدوجہد کے مقابلے میں یہ کہیں ہمہ گیر اور اپنے منہج میں روح قرآنی سے قریب تر ہوگی۔ اس مرحلے میں جن امور کا خیال رکھنا ہوگا انہیں اجمالاً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ نئی تحریک اصلاح کو ابتداء سے ہی ان اصطلاحات کے استعمال میں محتاط رہنا چاہئے جن کے پیچھے ایک ثقافتی تاریخ ہے۔ مثلاً Reformation یا Enlightenment جیسے الفاظ نہ صرف عام ذہنوں میں ان کوششوں کے سلسلے میں کنفیوژن پیدا کر سکتے ہیں بلکہ خود تحریک اصلاح ان اصطلاحات کے تاریخی اور تہذیبی بوجھ سے متاثر ہو سکتی ہے۔ مغرب میں ریفارمیشن کے پیچھے چرچ کے جبر و ظلم کی جو تاریخ رہی ہے اور جس طرح عیسائیت نے انسانی عقل پر صدیوں تالے

لگائے رکھنے کی کامیاب کوشش کی، جبر کی یہ صورتحال مسلم ثقافت کے بدترین ادوار میں بھی نہیں ملتی۔ احبار اسلام اور جابر حکمرانوں کے مقابلے میں اہل عزیمت کے فکری و عملی عروج کو بڑی حد تک مسلمہ اعتبار حاصل رہا ہے۔ لہذا جو لوگ آج اسلام میں کسی Luther یا Calvin کے ظہور کی تمنا کرتے ہیں وہ مسلم تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کچھ یہی حال Enlightenment کی اصطلاح کا ہے جسے فی نفسہ ان معنوں میں تو قبول کیا جاسکتا ہے کہ انسانی عقل کسی چیز کو قبول کرنے سے پہلے اسے ہر طرح لازماً پرکھے البتہ مغرب کے Enlightenment کے تجربے کو شاید ہی کوئی سلیم الفکر شخص عہد جدید میں دہرانا چاہے گا۔ ایسا اس لئے کہ جیسا کہ جرمن فلاسفر Max Horkheimer اور Theodor Adorno کا کہنا ہے Enlightenment سے جہاں بہت سے فوائد حاصل ہوئے وہیں Holocaust بھی اسی تحریک کا ایک فال آؤٹ ہے۔ بقول ازایہ برلن Enlightenment نے صرف Holocaust پیدا نہیں کیا بلکہ کمیونزم کا جبر، گلاگ بھی اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔ بات کچھ یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اٹھارہویں صدی میں عقل پر غیر معمولی انحصار کا نتیجہ یہ نکلا کہ Jefferson، Kant اور Hume جیسے اصحاب دانش بھی اس خیال کے اسیر ہو گئے کہ سفید فام اقوام کے مقابلے میں دوسری قومیں کم تر ہیں جنہیں تہذیب شناسی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح Enlightenment جو ابتداء میں دانش انسانی کا نقیب بن کر سامنے آیا تھا فی الواقع سفید فام اقوام کے جبر و استیلاء کا اعلامیہ بن کر رہ گیا ہے۔ نئے مصلحین اسلام کے لئے لازم ہوگا کہ وہ Enlightenment یا Reformation جیسی value-loaded اصطلاحوں سے یکسر اجتناب کریں۔

۲۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوتھر کی تحریک اصلاح جس نے عیسائی دنیا کو ایک فجر جدید کا مژدہ سنایا تھا اس کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ چرچ کے مقابلے میں scripture کو حکم کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ اس طرح Mandate of Humans کے مقابلے میں Mandate of God کی بالا دستی یقیناً ایک انقلاب انگیز خیال تھا جس سے عیسائیت کے علاوہ دوسرے مذاہب کی اصلاحی تحریکیں بھی اگر غذا حاصل کریں تو اسے تحسین کی نظر سے ہی دیکھا جانا چاہئے۔ البتہ مصلحین اسلام کے ذہن

میں یہ فرق واضح رہے کہ عیسائیت میں scripture کی جو حیثیت ہے، قرآن کا مقام اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن دوسرے صحفِ سماوی کے معنوں میں scripture ہے ہی نہیں لہذا اس کی تشریح و تعبیر باندازِ scripture نہیں کی جاسکتی۔ یہاں ایک ایک لفظ متعین، معروف، محفوظ اور منزل من اللہ ہے جس میں مرتبین یا مترجمین کی دخل اندازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ عرصے سے حکمائے اسلام نے عقل اور وحی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ رکھا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ علوم عقلیہ اور نقلیہ الگ الگ ماخذ سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ ایک کی بناء مشاہدے اور دوسرے کی بناء وجدان پر ہے۔ مسلم متکلمین مشاہدے کے مقابلے میں وجدانی علوم کے تفوق کے قائل رہے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں مشاہداتی علوم کے سلسلے میں ایک طرح کی بے توقیری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید، جو مسلمانوں میں وجدانی علوم کا بنیادی ماخذ ہے، تدبر و تفکر اور مشاہدے کی بھرپور وکالت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وجدان کی عمارت تعقل کی بنیادوں پر رکھی جائے۔ بھلا جو وجدان عقل کو قائل نہ کر سکے یا جو دانش انسانی کی پہنچ سے باہر ہو اسے انسانوں کے لئے مشعلِ راہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ قرآن فی نفسہ ایک rational discourse ہے جس کا اسلوب مفتیانہ یا dogmatic نہیں بلکہ reflective ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ خدا کی وحدانیت، انبیاء و رسل کی حقانیت اور دین کے طریقہ نجات ہونے کو بغیر کسی rational discourse کے قبول کر لیا جائے۔ اگر ایسا مطلوب ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ توحید و رسالت کی بنیادی دعوت کو باسالیب مختلف ساڑھے چھ ہزار سے زائد آیتوں میں بار بار بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

انسانی عقل کی بھی یہ کیسی آزمائش ہے کہ اپنی تمام تر تنگ دامانی کے باوجود اس پر کائنات کی ماہیت کے ادراک اور خالق کے عرفان کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ انسان انسان جو ٹھہرا، وہ عرفان ذات اور عرفان حق کے مختلف مراحل میں یقیناً غلطیاں کرے گا پھر اپنی غلطیوں سے سیکھے گا بھی۔ اندیشوں اور امکانات کے مابین اسے اختیار کی آزادی دے کر خدا خود یہ چاہتا ہے کہ انسانی عقل وحی سے اکتساب فیض کرتے ہوئے اپنی جولانیاں دکھائے۔ لہذا صرف اس اندیشے کے

پیش نظر کہ عہد جدید کے مصلحین حساس امور پر زبان کھولنے میں غلطیوں کا ارتکاب کر سکتے ہیں انسانی عقل پر پابندیاں نہیں لگائی جاسکتیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عقل و آگہی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کا رفیق و مددگار قرار دیا جائے۔ قدیم اسلامی تعبیرات کو ایسے منجمد عقائد (dogma) کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے جسے negotiate نہ کیا جاسکتا ہو۔ یہ کام خاصا آسان ہو جائے گا اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ ہمارے متقدمین جنہوں نے ماضی میں تشریح و تعبیر کا فریضہ انجام دیا ہے وہ بھی ہماری طرح انسان تھے جن سے لغزشوں اور التباسات کا صدور فطری ہے۔ ہم اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ دوسروں کے التباسات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔ ہمارے لئے ہمارے اپنے التباسات کا بوجھ ہی کیا کم ہے۔

۴۔ تقلید اور اصلاح ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور نہ ہی تقلید اور تنویر (Enlightenment) کا اجتماع ممکن ہے۔ دانش انسانی کے استعمال میں سابقین کے تجربات سے ہم کسب فیض تو ضرور کر سکتے ہیں البتہ اس بات پر اصرار نہیں کر سکتے کہ اس عمل میں ہمارے اور ان کے نتائج یکساں ہوں۔ اگر نتائج کی یکسانیت کو ہدف قرار دے دیا جائے تو غور و فکر کا سارا سلسلہ لایعنی قرار پاتا ہے۔ البتہ ہمیں اس بات کا التزام کرنا ہوگا کہ غور و فکر کے نئے مراحل میں تقویٰ شعاری کا دامن ہمارے ہاتھوں سے نہ چھوٹنے پائے۔ قرآن مجید کے مطالعے میں دانش انسانی کے ساتھ ساتھ تقویٰ شعاری کی نگہبانی بھی لازم ہوگی۔ اور یہ بھی ممکن ہے جب ہم علوم عقلیہ اور نقلیہ کو ایک دوسرے کا حریف تصور کرنے کے بجائے اس کے باہمی تعاون سے ایک ایسی روشنی کی تخلیق کر سکیں جسے reflective knowledge کہا جاسکتا ہے، جو Enlightenment کے بجائے Buddhist bodhi سے کہیں زیادہ قریب ہے۔ reflective knowledge میں نہ تو dogmatic fixity یا مفتیانہ انجماد پایا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ بے سمتی جو Enlightenment کی لازمی منزل post-modernism سے عبارت ہے۔

۵۔ ماضی میں مصلحین اسلام کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بعض امور کو تحقیق و تجزیے سے بالاتر قرار دے رکھا تھا جس پر کسی گفتگو کا دروازہ کھولنا ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر

اتحاد امت کے تمام علمبردار اپنے اپنے فقہی دائرہ کار کے اندر ہی فکری و عملی سرگرمیوں کو روا سمجھتے تھے۔ ائمہ فقہاء اور ائمہ محدثین کی عقل و دانش اور ان کے علمی کاموں کو منزل من اللہ کا درجہ حاصل تھا۔ بعض مصلحین مثلاً شاہ ولی اللہ جیسے علماء تو اس خیال کی بھی پر زور وکالت کرتے تھے کہ مسالک اربعہ کا تعین من جانب اللہ فیصلہ ہے جس میں متقدمین کو تائید ایزدی حاصل رہی ہے۔ فی نفسہ یہ کچھ اسی قسم کی بات تھی جس کا اظہار عیسائی علماء مروجہ بائبل میں پال کی تحریروں کے سلسلے میں اسے Holy Spirit کا مرہون منت بتاتے اور اسے من جانب اللہ تصور کرتے ہیں۔ نئے مصلحین کے لیے لازم ہوگا کہ وہ آخری رسول پر آنے والی وحی کے علاوہ کسی عام انسان کے الہام یا اس کو حاصل ہونے والی مفروضہ تائید ایزدی کو قطعی اہمیت نہ دیں۔ جب تک انسانی تعبیرات اور اس کے تعمیر کردہ مسالک کی بنیادیں نہیں ملتیں حقیقی اسلام کی طرف ہماری واپسی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

۶۔ آخری رسول کے تبعین کی حیثیت سے ہم سیادت عالم کے منصب پر فائز کئے گئے ہیں۔ اس عظیم فریضے کی ادائیگی کے لئے لازم ہے کہ ہم آفاقی طرز فکر کے حامل ہوں۔ افسوس کہ ہم صدیوں سے امت مسلمہ کے بجائے امت محمدیہ کی نفسیات میں محصور شب و روز قوم مسلم کے عروج کے لئے فکر مند اور سرگرداں ہیں۔ ہمارے اس isolationist رویے نے ہماری نظری اور نفسیاتی ہیئت ترکیبی کو بری طرح مسخ کر دیا ہے۔ رحمۃ للعالمین کے تبعین نہ جانے کن مفروضہ روایتوں کے زیر اثر آج اس خیال کے اسیر ہیں کہ جس رسول کو رحمۃ للعالمین کے منصب پر فائز کیا گیا تھا وہ خود دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوا کہ اس کی زبان پر صرف امتی امتی کا لفظ جاری تھا۔ کلمۃ سواء کی قرآنی بنیاد نئے مصلحین سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سکڑتی دنیا میں مختلف ادیان کے مابین ہونے والے مکالمے اور مباحثے کو بھی پیہرا نہ رخ دینے کی جدوجہد کریں۔ دائرہ امت سے باہر دنیا کو امن و سکون سے آشنا کرنے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان سے ہم خود کو الگ نہیں رکھ سکتے۔

۷۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اسلام کی چودہ صدیوں پر محیط تہذیبی ورثے پر بلا خوف لومۃ لائم تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ خدا کے کلام اور رسول کی سنت کے علاوہ ہمارے لئے کوئی چیز تحلیل و تجزیے اور محاکمے

سے بالاتر نہیں ہونی چاہئے۔ اس سرزمین پر کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر زباں بندی کو غایت دین سمجھا جائے یا جسے سیکورٹی زون قرار دے کر وہاں کسی مناقشے کو داخل ہونے سے روکا جائے۔ وحی ربانی کی روشنی میں جب تک ہم اپنی پوری تاریخ کا تنقیدی محاکمہ نہیں کرتے ہمیں اس بات کا واقعی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ پانی مرنا کہاں ہے۔

۸۔ نئے مصلحین کو اس بات کا التزام بھی کرنا ہوگا کہ وہ وحی ربانی کے مقابلے میں صدیوں کے متواتر عمل کو، خواہ اس پر مفروضہ اجماع کی مہر کیوں نہ لگ گئی ہو، از سر نو تحلیل و تجزیے کا موضوع بنائیں۔ اب یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ کسی مخصوص مسئلے پر فلاں فلاں فقہاء اور ائمہ کی کتابوں میں یوں لکھا ہے یا یہ کہ فلاں مسئلہ پر امت کا اجماع ہو چکا ہے جسے از سر نو بحث کی میز پر نہیں لایا جاسکتا۔ خدا کے علاوہ انسانوں کے کسی گروہ کو اس بات کا اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اجماع کا دھونس دے کر یا اہل حل و عقد کے حوالے سے ہمیں کسی مسئلہ پر تحلیل و تجزیے سے باز رکھے۔ یہ رویہ قرآن کے rational discourse کے خلاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خود توحید کے بنیادی اعتقادات کو ہمیں عقلی استدلال کے ذریعہ باور کرانا چاہتا ہے اور جب قرآن اپنے ماننے والوں سے اس بات کا طالب ہے کہ وہ تحقیق و تجزیہ کے ذریعہ اشیا کی مابیت تک پہنچنے کی کوشش کریں تو پھر عام انسانوں کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ اکثریت کے حوالے سے یا وجدنا آباءنا كذلك يفعلون کے سہارے ہمیں کسی مسئلہ کو طے شدہ یا closed for discussion باور کرائیں۔ نئے مصلحین پر لازم ہوگا کہ وہ نص قرآنی یعنی شرع اور مدون شریعت جیسا کہ وہ فقہ میں جلوہ گر ہوئی ہے، کے مابین امتیاز قائم کریں۔ اگر قرآن کی طرح فقہاء کے دواوین کو بھی یکساں تقدس عطا کر دیا گیا، جیسا کہ ماضی میں مصلحین کرتے رہے ہیں، تو پھر کسی نئی ابتدا کا امکان ختم ہو جائے گا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مکالمے اور مباحثے کی روایت دم توڑ چکی ہو اور جہاں صداقت dogmatic fixity سے عبارت ہو، نئے مصلحین کے لئے ایک نئے طرز فکر کی تعمیر یا ہمہ گیر discourse کی ابتدا کچھ آسان نہیں کہ ایسا کرنا بند معاشرے سے کھلے معاشرے میں داخل ہونے کے مترادف ہوگا۔ اتنی بڑی ابتدا یقیناً کچھ آسان نہیں لیکن اس کے علاوہ اب ہمارے پاس کوئی دوسرا متبادل ہے بھی نہیں۔



عباسی عہد میں مسلم شناخت اور مسلم عقائد پر جو بحثیں چلی ہیں اس کے زیر اثر ہمارے فقہاء مسلمان بنے رہنے کے لئے ان خواہر کو بھی مسلم شناخت کا حصہ قرار دے بیٹھے تھے جن کا تعلق اسلام کے آفاقی پیغام سے کہیں زیادہ عرب ثقافت سے تھا۔ جب تک مسلم ریاست بغداد، اسپین، ترکی اور ہندوستان میں جس شکل میں بھی باقی رہی علماء نے کیتھولک چرچ کی طرح اس بات کا پورا التزام کیا کہ خدا کی کتاب کے وہی مطالب و معانی سمجھے اور سمجھائے جائیں جو انہوں نے سمجھا ہے۔ خدا کی کتاب پر انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو تشریح و تعبیر کا کامل اختیار مل جانے سے عملاً یہ ہوا کہ عام انسانوں کا وحی ربانی سے براہ راست تعلق باقی نہ رہا۔ رفع فتنہ کی خاطر علماء کا یہ قدم خود ایک بڑا فتنہ بن کر رہ گیا۔

اسلام کو نئے شارحین کی ضرورت

عمرانہ قضیہ پر دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ اور اس پر مسلم پرسنل لا بورڈ کی توثیق نے کم از کم اس بات کی وضاحت تو کر ہی دی ہے کہ ہماری دینی درسگاہیں صرف حالاتِ حاضرہ سے ہی بے خبر نہیں بلکہ قرآنِ فہمی سے بھی نا بلد ہیں۔ قرآن مجید کی جس آیت پر اس فتویٰ کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ بڑی سیدھی، صاف اور تمام الجھاؤ سے مبرا ہے۔ ﴿لَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاءُكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہو۔ گویا کسی مرحلہ میں اگر کوئی عورت کسی کے باپ کی بیوی رہی ہے تو آگے چل کر خواہ طلاق کی صورت میں یا باپ کے مرنے کے بعد بیٹے کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان عورتوں سے رشتہ نکاح استوار کرنے کی سوچے۔ جو شخص بھی ذہنی تحفظات سے بالاتر ہو کر اس آیت کو پڑھے گا اس کے حاشیہ خیال میں بھی فقہاء کی وہ قیل و قال نہیں آئے گی جس کے نتیجے میں آج عمرانہ کے مسئلہ پر مختلف اور متضاد آراء کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

موجودہ صورتِ حال نے اہل فکر مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اسلام کا مستقبل ان روایتی علماء اور ان دینی اداروں کے ہاتھوں محفوظ ہے یا نہیں؟ ہندوستانی مسلمان اپنے دین کے سلسلے میں ہمیشہ سے حساس اور محتاط واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس ملک میں دین و شریعت کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں چلائیں اور قربانیاں دی ہیں۔ وہ اب تک یہ سمجھتے رہے ہیں کہ دینی مدارس اسلام کے قلعے ہیں لہذا اسے ہر بیرونی مداخلت سے محفوظ رکھنے کو انہوں نے دین کی حفاظت پر مبنی سمجھا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ان دینی اداروں کے ذریعے اسلام کی جو تشریح و تعبیر سامنے آرہی ہے وہ سراسر عقل اور قرآن کے خلاف ہے۔ اگر اسلام کو انہی روایتی علماء کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو خطرہ ہے کہ وہ فقہاءِ بیہود کی طرح اسے

ایک پیچیدہ فن میں تبدیل کر دیں گے اور عام انسانیت کے لئے اسلام میں کوئی کشش باقی نہیں رہ جائے گی۔

اسلام میں کسی ایسے طبقہ علماء یا مذہبی گروہ کو جواز نہیں بخشا گیا ہے جسے دینی یا روحانی پیشوائی کے منصب پر فائز کیا گیا ہو۔ علماء کرام اس بات سے خوب واقف ہیں کہ ﴿فاسئلوا اہل الذکر﴾ کے حوالے سے انہوں نے اپنے آپ کو مذہبی پیشوائی کے جس منصب پر متمکن کیا ہوا ہے اس کا جواز قرآن کی مذکورہ آیت سے نہیں نکلتا۔ لیکن افسوس کہ وہ اس آیت کے اصل مفہوم سے کتمان کرتے ہوئے اسے مسلسل اپنی دینی پیشوائی کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ جن علماء نے عمرانہ کو اپنے شوہر پر حرام ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے اور جس کے لئے انہوں نے فتاویٰ ہندیہ، ردالمحتار اور بحر الرائق جیسی کتابوں سے دلیل لانے کی ضرورت محسوس کی ہے، کیا بہتر ہوتا ہے کہ حلال و حرام کے فیصلے کے لئے انسانوں کی لکھی کتابوں پر انحصار کرنے کے بجائے وہ خدا کی کتاب کی طرف رجوع کرتے اور آیت مذکور کو اس کے پورے سیاق و سباق میں پڑھتے کہ اگر ایسا ہوتا تو فقہاء احناف کی آراء کی غلطی ان پر واضح ہو جاتی۔ یہ تو رہی فقہی معلومات کی بات۔ اگر ان حضرات نے معلومات کے علاوہ عقل و دماغ کا استعمال بھی کیا ہوتا تو یہ بات باسانی ان کے سمجھ میں آتی کہ جو کتاب ہر شخص کو اس کے کئے کا برابر پھل دینا چاہتی ہے جہاں ﴿کل نفس بما کسبت رھینہ﴾ اور ﴿ولاتنزر وازرة وزر اخری﴾ جیسی آیات بار بار اس حقیقت کو ذہن نشین کراتی ہوں کہ ہر شخص صرف اپنے عمل کا ذمہ دار ہے وہاں یہ بات کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے کہ باپ کے گناہ کی سزا بیٹے کو دی جائے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی عائلی زندگی تباہ ہو جائے۔ فقہاء کا یہ کہنا کہ اپنے خسر سے زنا کے بعد عورت اپنے شوہر کے لئے مثل ماں ہو گئی ہے دراصل وہ قانونی اور فقہی مویشگافیاں ہیں جس کے لئے فقہاء یہود معروف ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم نے فقہاء یہود کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب علماء یہود کی طرح ہمارے علماء بھی وحی ربانی پر راست غور و فکر کے بجائے اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر قدیم فقہاء نے کیا لکھا ہے۔ بھلا جو لوگ کچے حنفی ہوں ان کے لئے فقہاء احناف کی رائے سے انحراف کیسے ممکن ہے؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ قرآن کے نظام انصاف اور قرآنی آیت کے سیدھے سادھے مطلب سے صرف اس لئے صرف نظر کر لیں کہ علماء احناف نے اس کا مطلب کچھ اور سمجھا ہے۔

رہے معتدل علماء تو عام طور پر ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ جب فقہی مویشگافیاں اور قدیم آراء ہماری راہ میں حائل ہو جاتی ہیں تو وہ اس سے نکلنے کے لئے شافعی، مالکی یا حنبلی فقہ کا سہارا لیتے ہیں۔ خدا کی کتاب

کا سہارا لینے کی جرأت سے وہ بھی خالی ہیں۔ عمرانہ کے مسئلہ پر بعض معتدل علماء نے مسلک شافعی کے مطابق رائے دینے کی کوشش کی ہے اور باور کرایا ہے کہ کوئی حرام فعل کسی حلال کو فاسد نہیں کر سکتا۔ لہذا خسر کے ذریعہ زنا کا شکار بننے والی عورت کا رشتہ اس کے شوہر سے برقرار رہے گا۔ بظاہر اس رائے میں عقل و اعتدال کا استعمال معلوم ہوتا ہے البتہ یہ رویہ بھی قرآن مجید کی روشنی میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے بجائے آراء الرجال سے ہی غذا حاصل کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ امت مسلمہ کا تمام تر انحراف اور اس کے زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے قرآن مجید کے ارد گرد تاویلات کا حصار کھڑا کر رکھا ہے۔ ہم کسی مسئلے پر قرآن مجید کو بولنے ہی نہیں دیتے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسئلہ مذکورہ پر ہمارے مکتبہ فکر کے فقہاء نے کیا لکھا ہے۔ رہے وہ مسائل جن کا بیان ان کتب میں نہیں پایا جاتا تو ہم ہر نئی چیز کی اس وقت تک مزاحمت کرتے ہیں جب تک وہ رائج ہو کر ہمیں خود اپنے حصار میں لے لے۔ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے لے کر مشینی ذبیحے تک ہمارے علماء نے پہلے تو ہر چیز کو حرام قرار دیا پھر رفتہ رفتہ وہی حرام اتنا پسندیدہ ہو گیا کہ اب مانگ کے بغیر کوئی مولوی تقریر کرنا پسند نہیں کرتا۔ حق تو یہ ہے کہ حلال و حرام کا اختیار اللہ نے انسانوں کو دیا ہی نہیں ہے۔ تمام حلال اور تمام حرام قرآن میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ بات ذہن سے نکال پھینکنی ہوگی کہ اسلام کی تشریح و تعبیر کا حق کسی خاص طبقہ کو حاصل ہے۔ سچ پوچھئے تو اسلام خدا اور بندے کے درمیان براجمان ہونے والے اسی طبقہ احبار کے انہدام کے لئے آیا ہے۔ دنیا میں تمام نبی یہی دعوت لے کر آئے کہ وہ بندوں کا راست تعلق اس کے رب سے قائم کریں۔ کسی چرچ یا مولویت کے کسی ادارے کو بیچ میں حائل ہونے کا موقع نہ ملے۔ خدا کی کتاب کو چھوڑ کر حرام و حلال کے فیصلے کے لئے علماء کرام کی طرف دیکھنا یا قدیم فقہاء کی کتابوں میں ان کے اقوال تلاش کرنا انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے جسے قرآن ﴿اتخذوا احبارہم و رہبانہم اربابا من دون اللہ﴾ سے تعبیر کرتا ہے۔

اہل فکر مسلمانوں کو یہ بات سمجھنی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر قرآن مجید نازل فرمایا تھا فقہاء اربعہ کے دواوین نہیں۔ قدیم فقہاء بھی ہم جیسے انسان تھے جن سے غلطیوں کا صدور عین ممکن ہے۔ ہم اس بات کے سزاوار نہیں کہ ان کی غلطیوں کو اپنے کمزور کاندھے پر اٹھائے پھریں۔ ہمارے لئے ہمارے اپنے التباسات فکری ہی کیا کم ہیں۔ پھر کسی مسئلہ پر صرف چار فقہاء کی کتابوں کو ہی کیوں دیکھا جاتا ہے۔ ابوحنیفہ سے ابن جنبل تک کم از کم انتالیس ایسے ائمہ کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے جو ہم پایہ علمی

مرتبہ کے لوگ تھے اور جن میں سے بیشتر کی کتابیں زمانہ کی نذر ہو گئیں اور جن کے زیاں سے یقیناً اسلام کے فہم کو کوئی نقص نہیں پہونچا۔ پھر کیا ان چار ائمہ کے بغیر آج اس امت کا فہم قرآن ناقص رہ جائے گا؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب اہل فکر مسلمانوں کو دینا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ ائمہ اربعہ کا نزول من جانب اللہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی قرآن ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم آخری رسول کے بعد کسی اور شخص کو اپنے لئے کلی طور پر لائق اتباع قرار دیدیں۔ جو لوگ مسلم پرسنل لا بورڈ یا دیوبند کے دارالافتاء سے اس بات کے شکی ہیں کہ وہ عمرانہ قضیہ پر عقل و انصاف کی روشنی میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں اور جنہیں اس بات کی شکایت ہے کہ ہماری روایتی دینی درسگاہیں جو قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے کے لئے قائم ہوئی ہیں قرآن سے راست اکتساب کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتیں، انہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ ان حضرات کی جس طرح ذہنی تربیت ہوئی ہے اس میں قرآن مجید کا وہ مقام ہے ہی نہیں جس کی ہم ان سے توقع کئے بیٹھے ہیں۔ مدارس کے نصاب پر ایک نظر ڈالئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ وہاں قرآن کتنے گھٹے پڑھایا جاتا ہے اور اس کا کتنا حصہ نصاب میں شامل ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ دوسرے علوم بھی فہم قرآن میں معاونت کے لئے پڑھائے جاتے ہیں لیکن اگر یہ دعویٰ صحیح ہے اور قدیم سماجی عمرانی علوم اگر قرآن فہمی میں ہماری معاونت کر سکتے ہیں تو جدید عمرانی مطالعات کو اس نصاب سے خارج رکھنے پر قدیم علماء کا اصرار کیوں ہے؟

عمرانہ کو انصاف روایتی علماء کے فقہی قیل و قال کے ذریعہ مل سکے گا یا ملکی نظام کے اندر وہ انصاف کا کہیں زیادہ امکان پائے گی؟ اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس مسئلہ نے مفتیان کرام کی اہلیت اور علماء کی قرآن فہمی پر جو سوالیہ نشان لگایا ہے یہ داغ کیسے دھل سکے گا۔ جو لوگ حنفی فقہ کے مطابق عمرانہ سے اس کے خسر کے جرم کی پاداش میں اس کا شوہر چھین لینا چاہتے ہیں اور جو فقہ کی اس تعبیر کو شریعت الہی بتا کر اسے مسلمانوں کے پرسنل لا کے حقوق سے جوڑتے ہیں وہ زانی خسر کو صرف اس وجہ سے ملکی نظام قضاء کے سپرد کرنے پر مطمئن ہیں کہ یہاں چونکہ اسلامی قانون نافذ نہیں اس لئے اس کے خسر کو سنگسار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کیسی عجیب تاویل ہے کہ ایک فریق کے اوپر شریعت نافذ کرنے پر تو آپ اتنا اصرار کریں کہ اسے دین و ایمان کا مسئلہ بنادیں اور دوسرے فریق کو صرف اس لئے شریعت سے رہائی مل جائے کہ یہاں اسلامی قانون نافذ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جس طرح عمرانہ کا نکاح غیر قرآنی بنیادوں پر فسخ کرنے کی مہم چلائی جا رہی ہے اسی طرح محسن زانی کے لئے سنگساری کی سزا بھی قرآن پر ایک بہتان ہے کہ سورہ نور میں زانی کی اصل سزا ڈوڑے مارنا بتائی گئی ہے۔ لیکن جو لوگ فقہاء کی قیل و قال کو قرآن سے زیادہ اہمیت دیتے

ہوں وہ اس مفروضہ پر اصرار کرنے سے باز نہیں آئیں گے کہ آیت رجم قرآن میں موجود تھی جو کھو گئی یا اٹھالی گئی البتہ اس کا حکم باقی ہے۔ افسوس کہ ایسا کہنے والوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس شقیق القلسی کے ساتھ عصمت قرآن پر حملہ کر رہے ہیں۔

جب تک اہل فکر مسلمان اس بات کی کوئی منظم کوشش نہیں کرتے کہ دین مبین کی تشریح و تعبیر کا حق کچے پکے مفتیوں اور نیم خواندہ مولویوں سے لے لیا جائے، کسی طبقہ علماء پر انحصار کے بجائے مسلمان قرآن مجید پر انحصار کرے اور عام لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ اسلام میں کسی طبقہ علماء یا روحانی پیشوائی کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں ہے، اس وقت تک اغیار کے لئے ممکن رہے گا کہ وہ اسلام کی مضحکہ خیز تصویر پیش کرتے رہیں۔ ہندوستان کے پچیس کروڑ مسلمانوں کو اب یہ احساس ہو جانا چاہئے کہ دین کی حفاظت کے لئے خانقاہ و مدرسہ پر انحصار مناسب نہیں اب خود انہیں آگے بڑھ کر خدا کی کتاب کو تھام لینا ہوگا۔



عباسی بغداد کا فنونِ لطیفہ، مسلم اسپین کا سائنسی عروج، اور مغل سلطنت کے تاج محل یا لال قلعہ کے لافانی نفوش، جن کو مسلمان اپنی تہذیبی تاریخ کے سنگ میل کے طور پر پیش کرتے ہیں دراصل ہم ان تمام کاموں کیلئے مامور ہی نہیں کئے گئے تھے۔ قومی افتخار کی ان تمام علامتوں کا کارِ نبوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔

مابعد جمہوریت اور اسلام

ہم بہت تیزی کے ساتھ ایک ایسے عہد میں داخل ہو رہے ہیں جسے غالباً مابعد جمہوریت کا نام دینا مناسب ہو۔ کل تک جن انسانی اقدار کو ہمارے معاشرے میں قبولیت عامہ حاصل تھی آج وہ مسلسل زوال پذیر ہیں۔ اکرام انسانیت، حریت فکر و عمل اور ایک دوسرے کا باہمی احترام جس سے کسی مہذب معاشرہ کی شناخت قائم ہوتی ہے آج زبردست خطرے میں ہے۔ غور و فکر اور اظہار خیال کی آزادی، ایسا محسوس ہوتا ہے اب سلب ہو جائے گی اور یہ سب کچھ مشرق سے کہیں زیادہ مغرب میں ہو رہا ہے جسے جدید جمہوریت کے گہوارے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

گیارہ ستمبر کے وقوع نے تہذیبوں کے مابین تضادم کو ہوا نہیں دی ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد حریت فکری اور بند دماغی انسانیت اور فاشسزم کے مابین جاری معرکہ آرائی اب فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو گئی ہے۔ جو لوگ مغرب کی معاصر تاریخ پر نگاہ رکھتے ہیں اور جو گزشتہ ربع صدی میں پیش آنے والی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں سے واقف ہیں وہ یقیناً اس احساس سے خالی نہیں ہوں گے کہ گیارہ ستمبر سے بہت پہلے بلکہ سویت یونین کے زوال کے بعد ہی، مغربی دنیا آہستہ آہستہ Liberal Pluralism سے Evangelical Democracy کی طرف سفر کر رہی تھی۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ مغرب میں جمہوریت کے نام پر چند دولتمند ہاتھوں میں اقتدار کا جو ارتکاز ہوا تھا وہ رفتہ رفتہ ایک ایسے نظام کی داغ بیل رہا تھا جس کی صحیح تعریف کے لئے سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک الفاظ وضع نہیں ہوئے ہیں اور اسی لئے ہم اسے مابعد جمہوریت سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔ گو کہ امریکی معاشرے میں جمہوری اقدار کی فروخت کی بات اب بھی جاری ہے اور آج بھی امریکی خارجہ پالیسی کا بنیادی ہدف دنیا

کے مختلف حصوں میں جمہوری نظام کی توسیع اور اس کا استحکام بتایا جاتا ہے۔ لیکن ان بلند بانگ دعوؤں کے علی الرغم اب اس حقیقت سے پردہ اٹھ چکا ہے کہ امریکی پالیسی ساز جمہوریت کا فروغ تو کجا خود دنیا کی دوسری جمہوریتوں کو انگیز کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر ایک طرف جمہوری اقدار ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آزاد ریاستوں کی خود مختاری کا احترام کریں اور ان معاشروں میں رہنے والے لوگوں کو ان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی جینے کا حق دیں تو دوسری طرف Evangelical Democracy کے علمبردار یہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا پر امریکی طرز زندگی کی حکمرانی قائم ہو جائے۔ گویا آج فروغ جمہوریت کے نام پر امریکہ کی قیادت میں جو جنگ لڑی جا رہی ہے وہ ایک عالمی نظام استبداد کے قیام کی جنگ ہے۔ یہ گویا اس بات کی بہیمانہ کوشش ہے کہ پوری دنیا اب صرف کوکوکولا اور میگ برگڑ کے تہذیبی شکنجوں میں کس دی جائے۔

جمہوریت ہے کیا شے؟ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اقوام و ملل کے لئے اس سوال کے جواب مختلف ہو سکتے ہیں۔ جمہوریت کی کوئی ایک ایسی تعریف جس کے صحیح ہونے پر اصرار کیا جائے دراصل جمہوریت کی بنیادی روح کے منافی ہوگی۔ انسانوں کے کسی ایک طبقہ کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لئے زندگی جینے کا کوئی حتمی طریقہ متعین کر دے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اسے جمہوریت نہیں بلکہ فاشسزم کہا جائے گا۔ اگر امریکہ کا جمہوری معاشرہ اس بات کی ضرورت سمجھتا ہے کہ مجرموں کو سزائے موت جیسی انتہا پسند سزائیں دی جائیں تو اس کے لئے اس بات کا کیا اخلاقی جواز ہے کہ وہ فرانسیسی حکومت کے اس فیصلہ کی مخالفت کرے جس کے مطابق ریاستی اسکولوں میں اسکارف یا دوسری مذہبی علامتوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے اور نہ ہی اس کے پاس اس بات کے لئے کوئی اخلاقی جواز ہے کہ وہ مسلم حکومتوں سے اس بات کا مطالبہ کرے کہ یہ حکومتیں اپنی تہذیبی اور مذہبی اقدار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم جنس پرستوں کو قانونی اقلیت تسلیم کر لیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جمہوریت کی تنگ نظر اور جامد تعبیر نے جس کا اظہار بار بار مغربی دارالحکومتوں سے ہوتا رہا ہے روح جمہوریت کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ جمہوریت سیاسی اور سماجی تبدیلی کا ایک پرامن طریقہ ہے جسے انسانوں نے صدیوں کے تہذیبی سفر میں دریافت کیا ہے لیکن اب مغربی جمہوریت کے سلسلے میں یہ خام خیالی ختم ہو رہی ہے۔ اب جمہوریت نام ہے دو برائیوں میں سے کم تر برائی کے انتخاب کا۔ اور صرف مغرب میں نہیں بلکہ جہاں جہاں جمہوری معاشرہ مستحکم ہوا ہے وہاں کچھ ایسی ہی صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔ اہل نگاہ واقف ہیں کہ امریکہ اور

برطانیہ کے حالیہ انتخابات میں عوام کے لئے گندے انڈوں اور سڑے ٹماٹروں میں سے ہی کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ بش اور کیری، ٹوری اور لیبر کوئی بھی عوام کی پسندیدہ ترجیحات میں شامل نہیں تھے۔ مہذب جمہوری معاشروں میں جب عوام کی امنگوں اور ان کی آرزوؤں کے مطابق متبادل مفقود ہو جائے اور انہیں اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ ناپسندیدہ عناصر میں سے ہی کسی ایک کو منتخب کریں تو یہ انتخابات انسانی معاشرے کو آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لے جائیں گے اور یہ صورت حال اس دنیا کو رفتہ رفتہ صالح اور امن پسند انسانوں کے لئے ایک قید خانہ میں تبدیل کر دے گا۔ صاف محسوس ہو رہا ہے کہ آج سویت یونین کی عقوبت گاہیں اور نازی جرمنی کے تعذیبی مراکز گوشت نامو بے جیسے بے شمار Detention Facility کی شکل میں پرانی ہیمنیت کو نئے نام سے زندہ کر رہی ہیں۔

اس خطرے کے پیش نظر فطری طور پر ہمارے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ کیا ماضی کی طرح ایک بار پھر روح جمہوریت کو اپنے دشمنوں پر سرخروئی حاصل ہو سکے گی؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا کچھ آسان نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ما بعد جمہوریت جس صورت حال سے عبارت ہے وہاں اس بارے میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے کہ معاشرے میں قوت کے واقعی ماخذ کہاں پائے جاتے ہیں۔ بسا اوقات تو یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کا یہ پورا متحرک نظام کہاں سے کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ بظاہر دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو سکتا ہے کہ امریکی استعمار دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے فوجی اڈوں اور تعذیبی مراکز کے ذریعے اس دنیا کو اپنے شکنجے میں گسے ہوئے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس استبدادی نظام کے اندر کچھ ایسے نامحسوس اور پراسرار ہاتھ بھی ہیں جن پر اب کسی ریاست کا واقعی کنٹرول نہیں رہ گیا ہے۔ ملٹی نیشنل تجارتی کمپنیاں، بین الاقوامی نوعیت کی رفاہی تنظیمیں، بے پناہ وسائل رکھنے والے ٹرسٹ اور تہذیبی ادارے، غیر معمولی سرمایہ کی حامل مالیاتی تنظیمیں اور میڈیا چینل جو چند افراد کی ملکیت ہیں استبدادی نظام کے اندر غیر محسوس طور پر اپنا رول انجام دیتی ہیں۔ سرمایہ داروں کے اس چنگل میں موجودہ دنیا کچھ اس طرح پھنس کر رہ گئی ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک نئی تبدیلی کے لئے آغاز کہاں سے کیا جائے۔ اس صورتحال نے نہ صرف یہ کہ مغربی جمہوریت کو ایک اندھی گلی میں پہونچا دیا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ فرد جو مدتوں سے جمہوریت کا خوگر تھا اب اپنے آپ کو ایک نظری اور فکری خلا سے دو چار پاتا ہے۔

ما بعد جمہوریت کے عہد نے ہمیں ایک ایسی مایوسی سے دو چار کر دیا ہے جس کی نظیر ان لوگوں کے بیانات میں بھی نہیں ملتی جو کبھی تاریخ کے خاتمے کی پیش گوئی کیا کرتے تھے، کہ کل تک جو لوگ جمہوریت کی

فتح کے بعد تاریخ کے خاتمے کا بگل بجا رہے تھے ان کے ذہنوں میں یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور موجود تھی کہ تاریخ اپنے سفر کے خاتمے کے بعد دوبارہ اسی دائرے میں متحرک ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس موجودہ صورت حال ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ جمہوریت کے خاتمے اور اس کی ناکامی کے بعد اب انسانوں کے پاس کوئی نظریہ بچا ہی نہیں ہے۔ یہ احساس شدید تر ہوتا جا رہا ہے کہ تاریخ بے سمی کا شکار ہو گئی ہے اور ہم مستقبل سے بے خبر ایک نامعلوم منزل کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ مستقبل کے سلسلے میں اس بے یقینی نے ہم میں سے بہتوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ اے کاش! اس چلتی پھرتی بے سمت گردش کرتی ہوئی دنیا سے ہم خود کو علیحدہ کر سکتے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس دنیا سے اتر کر جائیں تو کہاں جائیں کہ کوئی دوسری متبادل دنیا موجود بھی تو نہیں۔ ان سرمایہ دارانہ کمپنیوں نے ذرائع ابلاغ کو بھی اپنا غلام بنا رکھا ہے مثال کے طور پر جنرل الیکٹرک کمپنی کو لیجئے جس کی ملکیت NBC, CNBC, MSNBC جیسی میڈیا کمپنی ہیں۔ اسی طرح CNN ٹائم وارنر کی ملکیت، ABC ڈزنی کی ملکیت اور CBS وائیکوم کی ملکیت ہے۔ سرمایہ داروں کے میڈیا چینل ہمیں وہی کچھ دکھاتے ہیں جو ان کی اپنی آرزوؤں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انہیں اندازہ ہے کہ اگر عام انسانوں کو اصل صورت حال کا ادراک ہو گیا تو دنیا پر ان کی موجودہ اجارہ داری باقی نہیں رہ سکے گی۔

یہ ہے وہ مایوس کن صورت حال جس سے ہم دوچار ہیں۔ بظاہر تو اس بات کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا کہ اس مستحکم استبدادی نظام کے خاتمہ کے لئے کوئی موثر تحریک مستقبل قریب میں اٹھ سکے گی۔ رہی مغرب میں چلنے والی امن کی تحریکیں یا انسانی حقوق کی انجمنیں جو اس صورت حال پر وقتاً فوقتاً واویلا مچاتی رہتی ہیں تو ان سے کسی بنیادی تبدیلی کی امید اس لئے نہیں کی جاسکتی کہ یہ تمام تحریکیں دراصل اسی سرمایہ دارانہ نظام کا توسیع ہیں جو اپنی مالی امداد کے لئے انہی سرمایہ دارانہ مالیاتی اداروں اور اوقاف پر انحصار کرتی ہیں۔ استبدادی نظام انہیں اسی وقت تک انگیز کرے گا جب تک کہ ان انجمنوں کی چلت پھرت سے نظام سرمایہ داری کو واقعی کوئی خطرہ نہ ہو۔ جو لوگ آج مغرب کی سڑکوں پر جنگ اور ماحولیات کی تباہی کے خلاف نعرے بلند کر رہے ہیں ہم ان کے اقدامات کو مستحسن تو ضرور سمجھتے ہیں البتہ ان سے کسی بنیادی یا انقلابی تبدیلی کی امید نہیں لگاتے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مغرب میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ جب یہ انجمنیں نظام سرمایہ داری کے لئے خطرہ بننے لگی ہیں استبدادی نظام نے فوری طور پر ایسے اقدامات کئے ہیں جس نے ان انجمنوں کی چیخ و پکار کو فی الفور بے اثر کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر اکتوبر 2000 میں

کوئی پچاس امریکی غیر سرکاری انجمنوں، جن میں مشہور زمانہ تنظیم انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس وائچ بھی شامل تھیں، نے اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ امریکی ریاست کو اس بات کا پابند کرے کہ شہریوں کے مابین ترجیحات اور نا انصافی کے خاتمے کو یقینی بنائے۔ گیارہ ستمبر کے واقعہ سے چند دن قبل ڈربن میں اقوام متحدہ نے نسل پرستی کے خلاف ایک اجلاس منعقد کیا تھا جس میں بہت سی غیر سرکاری تنظیموں نے ایک قرارداد کی حمایت میں آزاد منڈی کی معیشت کو بنیادی طور پر ایک ناقص نظام بتایا تھا گویا امریکی سرمایہ دارانہ نظام خود اپنے اندرون میں پلٹنے والی رفاہی انجمنوں کی زد پر تھا لیکن اس کا انجام کیا ہوا۔ گیارہ ستمبر کی آڑ میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا جو بگل بجایا گیا اس میں یہ ساری باتیں دب گئیں۔ دہشت گردی کے حوالے سے اظہار خیال پر اتنی پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ اس قسم کی تنقید اور ان مسائل پر کسی مباحثے کا سرے سے امکان ہی ختم ہو گیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ جمہوریت کی موت کے بعد اب ہمارے لئے اس کے علاوہ اور کیا چارہ کار رہ جاتا ہے کہ ہم دوسرے متبادل نظام کی تلاش تیز تر کر دیں۔ فی الفور کوئی ایسا متبادل موجود نہیں ہے جو اس جاری نظام کی جگہ لے سکے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ خدا کی کتاب آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے لیکن ہم صدیوں سے اسے جزدان میں لپیٹ کر رکھنے اور اس سے برکت حاصل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ عام مسلمانوں کے علاوہ اس سرزمین پر دوسرے مذہبی گروہ بھی موجود ہیں، وہ لوگ بھی ہیں جنہیں حضرت مسیح نے ’زمین کا نمک‘ اور ’پھاڑی کا چراغ‘ قرار دیا تھا اور وہ لوگ بھی جو آل یعقوب پر ہونے والے انعام و اکرام کے حوالے سے آج بھی خود کو خدا کا لاڈلا سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ اب ان پھاڑی کے چراغوں میں کوئی روشنی رہی اور نہ ہی خدا کی لاڈلی قوم سمجھنے والوں کے پاس دنیائے انسانیت کے لئے کوئی منصوبہ ہے۔ عرصہ ہوا اہل یہود کی مذہبی فکر صرف اپنی فلاح و بقا کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی نجات کی فکر میں لگے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیت اپنی تاریخ میں اتنے نظری حوادث سے دوچار ہوئی ہے کہ اس کی تاریخ نظری مصالحت کی داستان بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے انبیاء کے باقیات ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی ایک پرامن مستقبل کی امید میں اپنے اپنے دائروں میں متحرک ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام گروہوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ہم آج جس بحران سے دوچار ہیں وہ عالمی نوعیت کا ہے۔ استبدادی نظام کا شکنجہ بڑا سخت اور مضبوط ہے اس سے نجات کے لئے جب تک مشترکہ جدوجہد کا ڈول نہیں ڈالا جاتا کامیابی ممکن نہیں۔

جو لوگ صدیوں سے اس طرز فکر کے اسیر رہے ہوں کہ ایک نئی دنیا کی تعمیر میں وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ساتھ نہیں لے سکتے، ان کے لئے کسی مشترکہ جدوجہد کا ڈول ڈالنا کچھ آسان نہ ہوگا اور نہ ہی دوسری قوموں کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ کسی داعی گروہ کو جس کا مذہب مختلف ہو خیر کے کام میں کھلے دل سے اپنا تعاون دیں۔ گویا ایک مشترکہ جدوجہد کے لئے نظری بنیادوں کی تلاش کا کام اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ محمد رسول اللہ کے سچے وارثین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان نظری بنیادوں کو از سر نو اجاگر کریں جو ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ ہم خیر کے کام میں دوسری حلیف قوموں کا تعاون کس طرح حاصل کریں۔ قرآن کی نظر میں یہ بات کلمۃ سواء ہو سکتی ہے ایک مشترکہ ایجنڈا جو تمام انسانوں کی فلاح کا ضامن ہو۔ قرآن کی یہ نظری اساس غیر اقوام کے لئے دوبارہ باعث کشش ہو سکتی ہے جب انہیں یقین ہو جائے کہ محمد رسول اللہ کے تبعین ساری دنیا کو استبدادی نظام سے نجات دلانے کے لئے میدان میں آئے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر قوم مسلم کی حکمرانی کا خواب نہیں دیکھ رہے ہیں۔ بد قسمتی سے ماضی میں ایسا ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے نظری انقلابات کو قومی سلطنتوں کے استحکام میں استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لہذا آج اگر تبعین محمد کو ایک عالمی تحریک نجات کی قیادت سنبھالنی ہے تو انہیں عام انسانوں پر یہ بات واضح کرنی ہوگی کہ وہ سرمایہ دارانہ استبداد کے خاتمے کے بعد ایک ایسے قرآنی معاشرہ کی تشکیل کا منصوبہ رکھتے ہیں جہاں تمام ہی انسانوں کو پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع میسر آئیں گے۔ کسی سے نا انصافی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی کسی کو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ لسانی، نسلی، تہذیبی اور جغرافیائی نسبت کی وجہ سے نئی تہذیب کے حاشیے پر رہ گیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک ایسے آفاقی پروگرام میں تبعین محمد کو دوسرے مذاہب کی سعید روحوں کا تعاون نہ مل سکے۔

ہم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ آج ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ ماضی سے کہیں مختلف ہے۔ ٹیکنالوجی نے دنیا کو اتنا مختصر کر دیا ہے کہ اب یہاں کسی ایک گروہ کا دوسروں سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں۔ نئی دنیا ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ایک آفاقی نظریہ کی طالب ہے۔ لہذا جو لوگ جدید دنیا کی قیادت کی بات سوچتے ہوں انہیں پہلے اس بات کا التزام کرنا ہوگا آیا ان کا نظری ڈھانچہ ایک پیہرا نہ لب ولہجہ کا حامل ہے یا نہیں۔ ایک ایسا لب ولہجہ جو پوری دنیائے انسانیت سے خطاب کرتا ہو۔

آئیے ذرا اس نکتے کا تفصیلی بیان کیا جائے۔ عام ذہنوں میں اسلام کا جو تصور راسخ ہے وہ بالعموم دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ اولاً وہ پیغام جو خدا نے اپنے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ پر بذریعہ وحی اتارا، ثانیاً وہ

سماجی اور سیاسی تاریخ جو اسلام کے پیروکاروں نے گزشتہ صدیوں میں وضع کیا۔ گویا اسلام کے نام پر ہمارے ذہنوں میں صرف محمد رسول اللہ کی طرف بھیجا جانے والا پیغام ہی نہیں آتا بلکہ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ آج اس مروجہ اور متواتر اسلام میں جسے ہم مسلم تاریخ اور مسلم تہذیب کے نام سے جانتے ہیں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں جن کا تعلق عربوں، ترکوں، مغلوں اور دوسری اقوام کی اپنی مخصوص تہذیب سے ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ صدیوں کے تعاون میں یہ چیزیں مسلم شناخت کا جز بن گئی ہیں۔ اسلام کی آفاقیت میں ان ثقافتی عوامل کے شامل ہو جانے سے ہوا یہ ہے کہ آج دوسری اقوام اس ثقافت میں خود کو اجنبی محسوس کرتی ہیں۔ انہیں ایسا لگتا ہے گویا مسلمانوں کی تہذیبی ثقافت بھی اس آفاقی دین کا ایک جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغربی اقوام اسلام کو بالعموم ایک عرب مذہب کے طور پر دیکھتی ہیں۔ وہ محمد رسول اللہ کو صرف عالم عرب کا پیغمبر سمجھتیں ہیں۔ اسلام کے نام سے ان کے ذہنوں میں ایک ایسے مذہب کا تصور ابھرتا ہے جو مشرق وسطیٰ کے لوگوں کے لئے مخصوص ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کا آفاقی پیغام کسی ایسے خیال کی توثیق نہیں کرتا۔ البتہ ماضی میں ہمارے فقہاء نے دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کے خانوں میں جس طرح سمجھنے کی کوشش کی اس سے یہی تاثر پیدا ہوتا تھا کہ اسلام کو عربیت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ آج جہاں کہیں بھی احیائے اسلام کی بات ہوتی ہے عام ذہن یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ایک بار پھر اپنے غلبہ کا پلان بنا رہے ہیں۔ اسلام کے سلسلے میں اس قسم کی غلط فہمیوں کو رفع کئے بغیر ہم غیر مسلم اقوام کو عالمی انقلاب کے پروگرام میں شامل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس غلط فہمی کو ختم کرنا ہوگا کہ مستقبل میں غلبہ اسلام کی تحریک قومی مسلمانوں کے سیاسی یا ثقافتی غلبے پر منتج ہوگی۔ ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ اسلام ایک ایسی دنیا کے قیام کا علمبردار ہے جہاں تمام ہی انسان رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر مشترکہ طور پر خدائے واحد کی توحید کا نغمہ گائیں جہاں نہ کوئی قوم غالب ہو اور نہ مغلوب۔ یہی اسلام کی دعوت کا لب لباب ہے اور یہی ہے وہ توحید خالص جس کا اسلام داعی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سکڑتی دنیا نے ایک ایسے آفاقی اسلام کے ظہور کی راہ ہموار کر دی ہے۔

قرآن رہتی دنیا کے لئے کتاب ہدایت ہے اس کی معنویت جتنی کل تھی اتنی ہی آج بھی ہے۔ یہ جس طرح عربوں کو خطاب کرتا ہے اسی طرح غیر عرب اقوام بھی اس کے مخاطب ہیں۔ کسی قوم کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ قرآن چونکہ اس کی زبان یا اس کی سرزمین میں نازل ہوا ہے اس لئے خدائی اسکیم میں اسے وہی طور پر کوئی امتیازی مقام حاصل ہے۔ اور نہ ہی غیر عرب اقوام کو اس غلط فہمی کا شکار ہونا چاہئے کہ

مستقبل کے خدائی منصوبے میں ان کا مقدر اس مشن کے حاشیے پر رہنا ہے۔ مسلم اہل فکر پر یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ عباسی عہد میں مسلم شناخت اور مسلم عقائد پر جو بحثیں چلی ہیں اس کے زیر اثر ہمارے فقہاء مسلمان بنے رہنے کے لئے ان ظواہر کو بھی مسلم شناخت کا حصہ قرار دے بیٹھے تھے جن کا تعلق اسلام کے آفاقی پیغام سے کہیں زیادہ عرب ثقافت سے تھا۔ پھر آنے والے دنوں میں چونکہ رفع فتنے کی خاطر بحث کا دروازہ بند کر دیا گیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ باب اجتہاد بند ہے۔ اس لئے راسخ العقیدہ علماء نے اس بات کا خاص اہتمام کیا کہ ابتدائی عہد کی طرح عقائد کی بحثیں دوبارہ سر نہ اٹھائیں خواہ ایسا کرنے کے لئے انہیں قرآن مجید سے راست اکتساب کا دروازہ کیوں نہ بند کرنا پڑے۔ جب تک مسلم ریاست بغداد، اسپین، ترکی اور ہندوستان میں جس شکل میں بھی باقی رہی علماء نے کیتھولک چرچ کی طرح اس بات کا پورا التزام کیا کہ خدا کی کتاب کے وہی مطالب و معانی سمجھے اور سمجھائے جائیں جو انہوں نے سمجھا ہے۔ خدا کی کتاب پر انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو تشریح و تعبیر کا کامل اختیار مل جانے سے عملاً یہ ہوا کہ عام انسانوں کا وحی ربانی سے براہ راست تعلق باقی نہ رہا۔ رفع فتنے کی خاطر علماء کا یہ قدم خود ایک بڑا فتنہ بن کر رہ گیا۔ قرآن کی آفاقی انسانی تعبیرات کی تنگ نظری میں مقید ہو کر رہ گئی۔ یہ وہ صورت حال تھی جس نے آخری نبی کے متبعین کو مسلم قومی حصار میں قید کر ڈالا جس کے نتیجے میں انہیں اقوام عالم کی سیادت سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔

جیسا کہ ہم نے بتایا کہ دنیائے انسانیت کی موجودہ بے کسی اور بے سمتی ہم سے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس آفاقی پیغام کو مسلم قومی ورثہ سے نکال کر دنیائے انسانیت کے مشترکہ چارٹر کے طور پر پیش کریں۔ ہمارے خیال میں ماضی کے مقابلے میں کلمۂ سواء کی بنیاد پر انسانوں کی عمومی نجات کا امکان آج کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو سکڑتی دنیا میں اقوام عالم کے مابین گہرے رابطوں کی بحالی ہے جس میں انٹرنیٹ ایک اہم رول انجام دے رہا ہے اور دوسری وجہ خود مسلم معاشروں میں پائی جانے والی وہ عمومی فکر مندی اور بیداری ہے جس نے اہل فکر مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ احیاء اسلام کی پرشور تحریکوں اور بے شمار قربانیوں کے باوجود ہماری دوبارہ تنصیب امامت کا کام ابھی باقی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جس تہذیبی اسلام کی پرزور دعوت دیتے رہے ہیں اس کی جڑیں ہماری تہذیبی تاریخ میں ہیں قرآن مجید میں نہیں۔ اور یہ کہ کسی ثقافتی اسلام میں دوسری اقوام کے لئے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ دنیا کو موجودہ بے سمتی سے نجات دلانے کے خواہاں ہیں انہیں سب سے

پہلے تو اپنا نظری محاکمہ کرنا ہوگا آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری اسلامی سرگرمیوں میں اب پیمبرانہ وسعت اور آفاقیت کا فقدان ہے جو تمام اقوام کے دکھے دلوں پر مرہم رکھتی اور ان کی نجات کا مژدہ سناتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم پیمبرانہ اسلام اور تاریخی اسلام میں فرق کو محسوس کریں۔ اگر مسلمان فی زمانہ پیمبرانہ لب و لہجہ کی تشکیل میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ معاصر تاریخ کا اتنا بڑا وقوعہ ہوگا جس سے ایک دنیا جنم لے سکتی ہے۔



ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ گزشتہ چند صدیوں میں اسلام کا فکری سرمایہ مدافعت کی زبان میں کیوں لکھا گیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نظری طور پر دنیا کی قیادت کے لئے اٹھائے گئے تھے اور جنہیں آخری نبی کے متبعین کی حیثیت سے رحمت للعالمین کا فریضہ انجام دینا تھا وہ خود کو اقوام عالم کے مقابلے میں ایک فریق کی حیثیت سے اس قدر دیکھنے کے عادی ہوئے کہ ان کی نفسیات پر مدافعت پوری طرح غالب آگئی، تحریک دعوت یا تحریک رحمت کے حاملین تحریک مزاحمت کے ذہنی سانچے سے جب تک نہیں نکلتے ان کے لئے قرآن کے آفاقی پیغام سے فائدہ اٹھانا اور اسے بروئے کار لانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

تقلیب فکر و نظر کی دعوت

سعودی دارالحکومت ریاض کے مضافات میں جدید طرز کی قلعہ نما عمارتوں پر مشتمل ایک وسیع و عریض کیمپس واقع ہے۔ جامعۃ الامام کا یہ کیمپس جہاں دیٹی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ سطح پر اہتمام پایا جاتا ہے اپنی نوعیت کا واحد ادارہ نہیں۔ مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ، مصر کا شہرہ آفاق مدرسہ ازہر شریف اور اس قبیل کی نہ جانے کتنی دینی درسگاہیں دنیا بھر میں علوم شرعی کے حوالے سے معروف ہیں۔ ریاض شہر کی دوسری جانب کنگ سعود یونیورسٹی کا وسیع و عریض کیمپس ہے جسے سیکولر یا عصری تعلیم کے حوالے سے عالم عرب میں ایک ممتاز مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ جامعہ امام اور جامعہ سعود گو کہ ایک ہی شہر میں واقع ہیں لیکن ان دونوں کی دنیا مختلف ہے۔ ایک کے یہاں صرف علوم شرعی پر زور ہے، دوسرے علوم اس کی نظر میں لائق اعتنا نہیں تو دوسری طرف عصری علوم کے حاملین علوم شرعی کو اپنے فکر و نظر کے دائرے سے خارج سمجھتے ہیں۔ علم کی یہ اسلامی اور غیر اسلامی تقسیم مسلم دنیا میں صدیوں سے رائج ہے۔ اب یہ روایت اتنی مستحکم ہو گئی ہے کہ کوئی جہیں اس شہویت پر شکن آلود نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی کو اس خیال کی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے فکری زوال کا ایک بڑا سبب علم کے سلسلے میں ان کا اپنا پیدا کردہ التباس ہے۔ جو لوگ معاصر دانش گاہوں میں تعلیم پاتے یا درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں وہ صدیوں سے اس احساس تلے جیتے ہیں کہ وہ علوم شرعی کے حاملین کے مقابلے میں کمتر درجے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دوسری طرف روایتی دانش گاہوں میں علماء و شیوخ اس التباس فکری کے شکار ہیں کہ وہ وارثین انبیاء اور طالبان نبوت ہیں، علم کی حقیقی خدمت صرف وہی انجام دے رہے ہیں اور ان ہی کے حوالے سے آخرت کی فلاح و نجات کا فیصلہ ہونا ہے۔

مسلمانوں میں علم شرعی کی روایت جس کا سلسلہ صدیوں سے چلا آتا ہے دراصل ان کے دورِ زوال کی پیداوار ہے۔ استعمار سے پہلے جہاں بھی جس شکل میں بھی مسلم حکومتیں باقی رہیں، مسلمانوں کی درسگاہیں علم کی اس شرعی اور غیر شرعی تقسیم سے نا آشنا تھیں۔ اس بات کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ روایتی درس گاہوں کے نصاب میں آج بھی ان علوم و فنون کے باقیات کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں جو اپنے وقت میں عصری علوم کی ترقی یافتہ شکل سمجھے جاتے تھے۔ منطق و فلسفہ، ریاضی اور علم ہیئت، علم کلام اور عروض و بلاغت جیسے مضامین جو آج اپنی موجودہ شکل میں ازکارِ رفتہ معلوم ہوتے ہیں اپنے عہد میں عصری آگہی سے واقفیت کی دلیل سمجھے جاتے تھے۔ البتہ جب سے مسلم اہل فکر نے یہ سمجھ لیا کہ ان دانش گاہوں کا کام اب محض دین کی حفاظت ہے اقوامِ عالم کی قیادت و سیادت کا زمانہ چاچکا تب سے علم شرعی کے حاملین خالصتاً مدافعت کی نفسیات کے اسیر ہو گئے۔ فکر و نظر کا یہ زوال چند برسوں کی بات نہیں بلکہ اس کی جڑیں دور بہت دور ماضی بعید میں پائی جاتی ہیں۔

دینی مدارس جو علم شرعی کے حوالے سے اپنی دینی حیثیت پر استدلال کرتے ہیں ان کے پیش نظر اگر صرف یہ مقصد ہو کہ وہ مسلم معاشرے کے لئے واعظ و خطیب، امام اور قراء پیدا کریں گے جس کی بہر حال مسلم معاشرے کو ضرورت ہے تو محض اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے اتنے بڑے پیمانے پر متخصصین کی دانش گاہیں قائم کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ یہ ہدف مختصر عرصے میں جزوقتی نصاب کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اگر ان کا مقصد ایسے علما و مفکرین پیدا کرنا ہے جو جدید دنیا کی فکری و عملی قیادت کر سکیں تو یہ کام یقیناً ان دانش گاہوں سے نہیں ہو سکتا جہاں قدامت کو جزو نصاب سمجھا گیا ہے اور جہاں طلباء و اساتذہ کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی کہ نئی دنیا میں اقوام و ملل کے سامنے اس وقت کون سا ایجنڈا معرضِ بحث ہے۔

علم کیا ہے؟ الراخون فی العلم کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ قرآن مجید عالم کی کیا تعریف متعین کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا صحیح جواب فراہم کئے بغیر ہم اس ثنویت کا پردہ چاک نہیں کر سکتے جو علم کے سلسلے میں ہمارے یہاں رائج ہو گئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الزمر: ۹)۔ قرآن کی نگاہ میں علم کے دو مآخذ ہیں: وحی اور عقل۔ وحی وہ شاہِ کلید ہے جس سے اگر صرف نظر کیا جائے تو عقل بے مہار گمرہی کی طرف لے جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس وحی کی روشنی میں عقل کا سفر انسان کو حقیقت کی نقاب کشائی کا متمثل بناتا ہے۔ وہ لوگ جو آیت اللہ پر غور و فکر کے ذریعہ خالق کا عرفان

حاصل کر سکیں اور جن کے قلوب اس کی خشیت اور جاہ جلال سے مہبوت ہو جائیں وہی لوگ ہیں جنہیں صحیح معنوں میں عالم کہا جاسکتا ہے۔ ﴿انما یخشی اللہ من عبادہ العلموا﴾ (فاطر: ۲۸)۔ قرآن مجید کے نزدیک رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کی آیات کی تلاوت کے ذریعے انسانوں کے قلب و نظر کی تشکیل کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کا بیان اور خود رسول کو اس کا حکمت پر مامور کرنا اس بات پر دال ہے کہ قرآن جو انسانوں کے لئے شاہ کلید ہے اس کو برتنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے عقلی رویے کی ضرورت ناگزیر ہے۔ دل و دماغ کو متحرک کئے بغیر اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

حکمت کیا ہے؟ بعض متقدمین کو کتاب کے ساتھ حکمت کے تذکرے سے یہ اشتباہ پیدا ہوا ہے کہ کتاب اگر قرآن ہے تو حکمت سنت۔ لیکن قرآن مجید کی ان تمام آیات کو سامنے رکھنے سے، جہاں مختلف سیاق میں حکمت کا لفظ وارد ہوا ہے، اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس حکمت کے معنی ایک عقلی رویے کی تشکیل اور دل و دماغ کو متحرک رکھنے سے عبارت ہے۔ اس بات کی تائید جابجا آیت حکمت کے مطالعے سے ہوتی ہے جیسا کہ حضرت داؤد کے حوالے سے وارد ہے کہ انہیں اللہ نے اقتدار اور حکمت سے نوازا (بقرہ: ۲۵۱)۔ اسی سیاق میں آگے ارشاد ہے ﴿یؤتی الحکمۃ من یشاء و من یرت الحکمۃ فقد أوتی خیرا کثیرا﴾ (البقرہ: ۲۶۹)۔ ایک دوسری جگہ آل ابراہیم کے حوالے سے انہیں کتاب و حکمت اور ملک عظیم عطا کرنے کا تذکرہ ہے (نساء: ۵۴)۔ سورہ نساء میں مسلمانوں کو یہ مشورہ بھی دیا جا رہا ہے کہ وہ لوگوں کو دین کی دعوت دینے میں کمال حکمت اور موعظہ حسیہ سے کام لیں۔ قرآن کی لغت میں حکمت دراصل ایک بہت جامع لفظ ہے۔ یہ ایک ایسا ذہنی رویہ ہے جو انسانی دل و دماغ پر وحی کی ضیا پاشیوں سے تشکیل پاتا ہے۔ اس کے برعکس خالص تعقل پسندی انسان پر ان امور کی نقاب کشائی نہیں کر سکتی جو وحی کا طرہ امتیاز ہے۔

عہد رسولؐ کی تہذیبی اور فکری زندگی پر غور کیجئے۔ توحید خالص کی دعوت نے اوہام و خرافات میں ڈوبے ہوئے بت پرست معاشرے میں ایک ایسی ہلچل پیدا کر دی تھی کہ نفع و نقصان کے میزانیے کو لات و منات سے وابستہ کرنے کے بجائے خالص عقل کی کسوٹی پر دیکھا جانے لگا۔ قرآن اہل کفر کے سلسلے میں بار بار یہ کہتا ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے، صاف روشن حقیقتوں پر غور و فکر نہیں کرتے۔ اسی طرح قصہ ابراہیمؑ میں اس عقلی مکالمے کو ملاحظہ کیجئے جہاں اصنام پرستی کے خلاف یہ دلیل لائی گئی ہے کہ جو بت اپنے

نفع و نقصان پر قادر نہیں وہ بھلا دوسروں کو کیا فیض پہونچا سکتے ہیں۔ دل اگر حق کا متلاشی ہو تو وہ عقل کے سہارے منزل مراد کو پہنچ سکتا ہے۔ یہی ہے کتاب و حکمت کے امتزاج کا حاصل۔

ابتدائی عہد میں مسلمانوں کی پہلی نسل جس حیرت انگیز طریقے سے اقوام عالم پر اپنی فضیلت قائم کرتی رہی اس کے پیچھے ایک بڑا محرک کتاب و حکمت سے تشکیل پانے والا قلب سلیم تھا۔ عہد اولیٰ میں ہمارے علماء و مفکرین کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہمارا کام صرف علم شرعی کی تحصیل و تحفیظ تک محدود ہے۔ رہی خدا کی کائنات کی تسخیر اور اس میں پائی جانے والی مختلف اقوام و ملل کی امامت تو اس دنیا داری سے بھلا علماء کرام کا کیا واسطہ۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ابتدائی عہد میں تفقہ فی الدین کی بات تو سنائی دیتی ہے البتہ علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ابتدائی عہد میں ہمارے لئے یہ خیال بھی اجنبی تھا کہ مسلمانوں میں عامۃ الناس سے الگ، علم دین کے حوالے سے، علماء و مشائخ کا کوئی طبقہ اپنی علیحدہ حیثیت اور فضیلت پر اصرار کرے گا۔ آج جو پوری دنیا میں مسلمانوں کے مابین علماء و شیوخ کا ایک طبقہ دیکھنے کو ملتا ہے جس نے اپنے لباس، عادات و اطوار اور طریقہ کلام سے اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے ممتاز کر رکھا ہے، کسی ایسے طبقہ کا وجود کم از کم پہلی صدی ہجری کے آخر تک نہیں پایا جاتا۔ علم کے حوالے سے طبقہ علماء کی باضابطہ تشکیل کا کام عہد عباسی میں انجام پایا۔ قاضی ابو یوسف اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے لئے عام لوگوں سے الگ ایک ایسے مخصوص لباس کا تعین کیا جسے عہدہ قضا کے حوالے سے رفتہ رفتہ طبقہ علماء میں قبولیت حاصل ہوگئی اور جسے آج مختلف شکلوں میں مختلف معاشروں میں علماء اسلام نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہی عہد علم کے حوالے سے ائمہ محدثین اور ائمہ فقہاء کے ظہور کا بھی ہے۔ اسی عہد میں قراء کے مقابلے میں محدثین کی سماجی حیثیت بڑھتی گئی اور یہ خیال عام ہوا کہ اصل علم روایتوں کی تجمع اور تحفیظ سے متعلق ہے۔ اسی عہد میں عالم کی قرآنی تعریف التباس فکری کا شکار ہوئی اور پھر آگے کی صدیوں میں رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آپہونچی کہ باقاعدہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم عمل میں آگئی۔ غیر شرعی علوم کے سلسلے میں چونکہ یہ خیال عام ہوا کہ وہ دنیا داروں کا میدان ہے اس لئے عام مسلم ذہنوں میں تسخیر کائنات کے سلسلے میں بے توقیری کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے برعکس علماء و مشائخ نے آخرت کے حوالے سے معاشرے میں اپنی سماجی توقیر میں خاصا اضافہ کر لیا۔ آگے چل کر جو لوگ تسخیر کائنات کے علوم سے وابستہ رہے یا جنہوں نے مسلم معاشرے میں سائنس و طب کی بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بھی ایک طرح کے احساس پیشانی سے دوچار رہے، انہیں ایسا لگتا تھا

جیسے علوم شرعی کے مقابلے میں تسخیر کائنات کے شعبے سے ان کی وابستگی کوئی گھٹیا درجے کا فریضہ ہے۔ اس طرز فکر نے رفتہ رفتہ مسلم معاشرے کو تسخیر کائنات کی قرآنی دعوت سے غافل کر دیا۔ علم کے نام پر اب ہمارا کل سرمایہ علوم نقلیہ تک محدود ہو گیا اور علماء کا یہ وظیفہ قرار پایا کہ وہ متقدمین کی کتابوں سے ان کے فہم دین کو ہم تک منتقل کرتے رہیں۔ بلکہ بعد کے عہد میں تو علماء نے یہ کام بھی اپنے ذمہ لے لیا کہ وہ متقدمین کی تشریح و تعبیر کے علاوہ ہرگز کسی نئی فہم کو اعتبار عطا نہیں کریں گے۔

فی زمانہ علم کے حوالے سے مسلم دنیا جس التباس فکری کی شکار ہے کچھ یہی صورت حال اہل یہود کے ربانیوں نے بھی کوئی دو ہزار سال سے پیدا کر رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فقہاء یہود کے نزدیک زندگی کا بنیادی وظیفہ توراۃ کا پڑھنا پڑھانا، اس کی تشریح و تعبیر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ روزی کمانے کے لئے بھی حیل شرعی کے ذریعہ یہ راستہ نکالا گیا کہ اس کی اجازت صرف اس شکل میں دی جاسکتی ہے جب کمانے والا اس نیت سے کمائے کہ وہ توراۃ کے طالب علموں پر اپنی کمائی صرف کرنا چاہتا ہو۔ رہا توراۃ کے علاوہ کسی اور کتاب کا مطالعہ تو فقہاء یہود کے نزدیک یہ ایک سنگین جرم تھا۔ معبد کی دوسری تباہی کے بعد اہل یہود کے تمام بڑے دماغ علم شرعی کے سلسلے میں پیدا کردہ اپنے اس مغالطے کے اسیر رہے۔ ایسا نہیں کہ ان کے یہاں دو ہزار سالوں میں بڑے دماغ پیدا نہ ہوئے ہوں لیکن ان کی تمام تر تزکنازیوں کا میدان ربائی ادب کی قیل و قال رہی۔ ان کے بہترین دماغ اس طرح کی شرعی بحثوں میں اپنی قوت ضائع کرتے رہے کہ سبت کے دن کس کس عمل سے اس کی حرمت پامال ہو سکتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات بھی موضوع بحث بنی کہ خدا ترس یہودی سبت کے دن ٹوائکیٹ فلش کر سکتے ہیں یا نہیں۔ دنیا ان دو ہزار سالوں میں اہل یہود کے کسی بڑے دماغ سے نا آشنا رہی۔ البتہ جب اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشرقی یورپ میں ان کے بعض فقہاء نے حیل شرعی کے سہارے شرعی علوم کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنے کی راہ نکالی تو انیسویں اور بیسویں صدی میں اہل یہود کے خانوادہ سے علماء و مفکرین کا ایک سیلاب سا آ گیا۔

راسخ العقیدہ یہودی جزئیات و رسومات کی بڑی باریک بینی سے پابندی کرتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کے الفاظ میں ’مجھ پر چھاننے اور اونٹ نکل جانے‘ کا محاورہ ان پر صادق آتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے یورپ میں جب دنیا صنعتی انقلاب کی آہل پتھل سے دو چار تھی، اہل یہود کے ربائی اپنی قوم کو اس بات کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ نئے انقلاب کی ماہیت اور اس کے اسباب کا مطالعہ کریں۔ مگر انسانی شب و روز میں کچھ لمحات ایسے بھی تو ہوتے ہیں جب توراۃ اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔

مثال کے طور پر بیت الخلا میں جو وقت گزرتا ہے، کیا اس دوران سیکولر علوم کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے؟ بعض یہودی فقہاء نے ایسے اوقات میں دنیوی علوم کے مطالعہ کی اجازت دیدی۔ پھر کیا تھا جسے دیکھئے اس فقہی گنجائش سے فائدہ اٹھانے لگا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشرقی یورپ کے یہودی گھرانوں میں گھنٹوں بیت الخلا میں وقت گزارنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس عہد میں عام طور پر اہل یہود کے اہل فکر قبض کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔

اہل یہود کے ہاں اس حیل شرعی کے ذریعہ دنیوی علوم پر لگی پابندی کا جو بند ٹوٹا ہے تو پھر یہ سلسلہ روکے نہیں رکھا۔ دیکھتے دیکھتے انیسویں اور بیسویں صدی میں قوم یہود سے علماء و مفکرین کی ایک فوج نکل آئی جن کے دل و دماغ نے انیسویں اور بیسویں صدی کی بساط سچانے میں کلیدی رول ادا کیا۔ اہل یہود کے اس تجربہ میں ہم مسلمانوں کے لئے عبرت کا بڑا سامان پوشیدہ ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے یہاں شرعی اور دنیوی علوم کی شمولیت دور کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں البتہ اب تک ہمارے علماء اس ادراک سے خالی رہے ہیں کہ علم کے سلسلے میں اس التباس نے ہمارے زوال میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور یہ کہ اس شمولیت کو دور کئے بغیر ہم سیادت کے راستہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ابو حامد غزالی نے احیاء العلوم میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کو طب، ہندسہ جیسے علوم سیکھنا چاہئے تاکہ وہ غیر مسلموں کے محتاج نہ ہوں۔ البتہ یہ خیال کہ ان علوم کا سیکھنا ہی دراصل علم کی تکمیل سے عبارت ہے ہمارے فکری چوکھٹے میں اب تک پوری طرح نہیں سما سکا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم اہل فکر کتاب و حکمت کے اس امتزاج اور اس کے مضمرات کا کسی حد تک ادراک کریں۔ البتہ جو لوگ عرصے سے علماء یہود کی طرح علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کے قائل رہے ہیں ان کے لئے کسی ایسی حقیقت کا ادراک تقلیب فکر و نظر کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے بغیر اور دوسرا کوئی مختصر راستہ ہے بھی نہیں۔

بین الاقوامی کاؤنسل برائے اسلام

دنیا بحران کی زد میں ہے اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ کہ امت مسلمہ جسے ان نازک لمحات میں انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے سامنے آنا چاہئے تھا، اپنے داخلی خلفشار میں گرفتار ہے۔ دنیا کے مرکزی اسٹیج سے امت مسلمہ کے غیاب نے ان لوگوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے جنہیں نہ تو کسی آسمانی ہدایت کی ہوا لگی ہے اور نہ ہی انہیں احترامِ آدمیت کا کوئی پاس ہے۔ ہم ایک ایسی خدا بیزار، اخلاق باختہ، بے سمت تہذیب کے شکنجہ میں پھنس گئے ہیں، جس نے عالمگیریت کے نام پر پوری دنیا کو عملاً ایک عالم گیر جہنم میں تبدیل کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سر زمین کے باشندوں پر مستقبل کے سلسلے میں شدید مایوسی اور کنفیوژن کی فضا طاری ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ اس بے سمت تہذیب کا اگلا قدم کہاں جا پڑے گا اور اس کے اسرار و عواقب کیا ہوں گے؟

آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے متبعین محمدؐ معاصر تاریخ میں ایک خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ اور اس کے رسولؐ نے یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ مستقبل میں عالم انسانیت کی رہنمائی اور اس کی دادرسی کا فریضہ انجام دیں۔ البتہ اگر آج اس فریضہ منصبی کے باوجود مسلمان تاریخ کے حاشیے پر نظر آتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ عرصے سے اپنے بارے میں خود ساختہ غلط فہمیوں کے اسیر ہیں۔ اولاً بجائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو خیر امت کی حیثیت سے دیکھتے جس پر پوری انسانیت کے مستقبل کا انحصار ہوا اور جس کے ذمہ اللہ نے زمین پر عدل کے قیام کا فریضہ عائد کیا ہو، مسلمان صدیوں سے اپنے مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اب وہ تمام امور پر خالص قومی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ دوسروں کی بھلائی کے لئے برپا کی جانے والی امت کا حال یہ ہے کہ اس کی نگاہ اپنے

قومی امور اور ملی فلاح و بہبود سے آگے نہیں دیکھ پاتی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پوری دنیا کی سیادت پر فائز کیا تھا لیکن وہ اپنی پیدا کردہ غلط فہمیوں کے زیر اثر دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کی فقہی اصطلاحوں میں دیکھنے کے اس حد تک اسیر ہوئے کہ بسا اوقات ایسا محسوس ہوا گویا اس مفروضہ دارالکفر سے اہل اسلام کا کچھ بھی علاقہ نہیں۔ ثانیاً قرآن مجید نے تبعین محمدؐ پر تاریخ کے آخری لمحے تک اقوام عالم کی رہنمائی کا جو فریضہ عائد کیا تھا اس میں انبیائے سابقین کی امتوں اور دوسری تہذیبوں میں پائی جانے والی سپرد کردہ نفوس کو فطری حلیف کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ گویا توحید خالص کی بنیاد پر عدل و انصاف کے قیام میں ہانکے پکارے ہر ایک کو اس کی بساط بھر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ آنے والے دنوں میں قرآن کی یہ وسیع القلمی بعض سیاسی عوامل کے زیر اثر فقہاء کی قیل وقال کی نظر ہو گئی۔ جو لوگ ہمارے فطری حلیف ہو سکتے تھے انہیں حریف کے طور پر دیکھنے کا رواج پیدا ہوا اور مسلمانوں میں اس خیال نے قبولیت حاصل کر لی کہ ہم بھی دوسری امتوں کی طرح بس ایک امت ہیں جن کے لئے اپنی ملی زندگی کی ترتیب و تدوین دیگر اقوام سے الگ رہ کر ہی انجام دینے میں عافیت ہے۔ ثالثاً تبعین محمدؐ مجموعی طور پر اس بات کے سزاوار قرار دیئے گئے تھے کہ وہ وحی کی روشنی میں تاریخ کے آخری لمحے تک اقوام عالم کی قیادت کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ آخری رسولؐ کا تصور فی نفسہ اس بات کا اعلان تھا کہ تبعین محمدؐ کو آپؐ کے غیاب میں کائنات کا فریضہ انجام دیتے رہنا ہے۔ یہ اتنی بڑی ذمہ داری تھی کہ اس کا عظیم کے لئے پوری امت کو ہر لمحہ آنکھیں کھلی اور دل و دماغ کو بیدار رکھنا ضروری تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تاریخ پر امت کی گرفت ڈھیلی پڑتی۔ لیکن عملاً ہوا یہ کہ قرآن مجید سے اس راستہ رابطے کا کام امت نے صرف طبقہ علماء کے ذمہ کر دیا اور وہ خود من حیث الامت راست قرآن مجید پر انحصار کے بجائے علماء پر انحصار کے عادی ہوتے گئے۔ دوسری طرف علماء تصور علم کے سلسلے میں اپنے پیدا کردہ التباسات کے زیر اثر وحی کی روشنی سے مسلسل دور ہوتے گئے۔ صورت حال یہاں تک آ پہنچی کہ قدامت کے اقوال اور ان کی فکری جولانیاں نئے علماء کا مبلغ علم بننے لگے۔ آگے چل کر اس صورت حال نے نئے تازہ خیالات کے امکانات ختم کر دیئے۔ پوری امت اس بندرستی کی زد میں آ گئی جس کا بیان قرآن مجید میں اہل یہود کے حوالے سے حصول عبرت کے لئے آیا ہے: ”وَكُونُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ“۔ رابعاً اسلام میں طبقہ علماء کا قیام ایک بڑی بدعت تھی۔ یہ گویا پھر سے دینِ براہمی میں احبار و رہبان کے ادارے کو زندہ کرنا تھا۔ عوام اس خیال سے مطمئن رہے کہ قندیلِ ربّانی کی حفاظت کا کام علماء نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے، کائنات کے سلسلے میں وہ چاق و چوبند ہیں اور دوسری

طرف علماء اس مغالطے کے اسیر ہو گئے کہ پچھلوں نے غور و فکر کا سارا کام انجام دے ڈالا ہے۔ قرآن مجید سے ساری ہدایت مستخرج ہو کر اب دواوین فقہ میں مدون ہو چکی ہیں۔ اب دل و دماغ کو حرکت دینے کے بجائے ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قدماء کے اقوال سے لوگوں کو باخبر کرتے رہیں۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں قرآن مجید کے راست دخل کو عملاً معطل کر دیا۔ خامساً طبقہ علماء جنہیں وارثین نبوت کا درجہ حاصل ہو گیا تھا، ان کا اوڑھنا بچھونا قدماء کے اقوال اور ان کے تحریر کردہ حواشی تھے۔ ان کے یہاں علم کا مفہوم انتہائی محدود ہو کر ان کتب تک محدود ہو گیا تھا جو پچھلی صدیوں میں نقلی اور عقلی علوم کے حوالے سے قدماء میں معروف رہے تھے۔ عالم کی قرآنی تعریف کہ کائنات پر غور کرتے ہوئے اس پر خشیت طاری ہو جاتی ہے، سے یہ مروجہ علماء کو سو دور تھے۔ ﴿فاسألوا اہل الذکر﴾ کے حوالے سے اہل فتاویٰ نے اپنے لئے جو گنجائش پیدا کر رکھی تھی کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس آیت کا سابق دراصل علمائے اہل یہود ہیں۔ طبقہ علماء کے قیام اور انہیں دینی اتھارٹی کی حیثیت مل جانے سے گویا اسلام میں ایک طرح کی یہودیت داخل ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیادت عالم پر فائز کی جانے والی امت علم کے حوالے سے ایسی فقہی موٹو گائیڈ کی اسیر ہو گئی جن کی تمام تر جولانیاں چند مسائل تک محدود تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ پر امت کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔

امت مسلمہ کا زوال صرف مسلمانوں کا قومی نقصان نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آخری وحی کو منجمد کئے دینے اور اسے اہل یہود کی طرح کتاب برکت میں تبدیل کر دینے کی وجہ سے پوری انسانی تاریخ بحران کی زد میں آ گئی ہے۔ گذشتہ چند صدیوں میں دنیا کے مختلف ملکوں میں علوم کی ترقی اور انسانی زندگی کو بہتر بنائے جانے کی تمام تر اسکیمیں وحی سے بے نیاز ہو کر بنائی گئی ہیں۔ اس لئے ہماری ترقیاں مسلسل نئے نئے مسائل کو جنم دینے کا باعث بنی ہیں۔ احترام آدمیت کا خاتمہ، پیداوار کی جنونی دوڑ، چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز، اسلحوں کی عالمی صنعت، ماحولیات کی تباہی اور دنیا کا ایٹمی بھٹی میں تبدیل ہو جانا، یہ وہ صورتحال ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا پر سوار ہیں جس پر ہماری گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ مہیب، خوفناک مستقبل کے خوف سے ہم لرزے جاتے ہیں۔ صورت حال کی اس سنگینی کا ادراک اب بڑی حد تک عام ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں بھی اس خیال کا برملا اظہار کر رہی ہیں کہ پیغمبروں کے ورثے سے مکمل غفلت اور وحی ربانی سے ہماری مزید بے نیازی کی اب کچھ زیادہ گنجائش نہیں۔ دنیا کو موجودہ بحران سے نجات دلانے کے لئے مختلف مذاہب کے علماء و مفکرین گاہے بے گاہے مشترکہ

جدوجہد کی آواز بھی بلند کر رہے ہیں۔ امت مسلمہ کی خود ساختہ معزولی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس بحرانِ عظیم کی ماہیت کا صحیح اندازہ البتہ ہمارے یہاں ابھی تک عام نہیں ہوا ہے۔ ہم آج بھی خیر امت کا ورد کرنے اور اپنے ارد گرد تلخ حقائق سے آنکھیں بند کئے رکھنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔

ایک ایسی صورت حال میں جب اقوامِ عالم میں کسی اخلاقی، مذہبی اور الوہی ہدایت کی ضرورت کا احساس شدید ہو چلا ہو اور جب لوگ بلا تکلف اس ضرورت کا اظہار کر رہے ہوں کہ دنیا کو موجودہ بے سمتی سے نجات دلانے کے لئے تمام ہی تہذیبوں میں پائی جانے والی سعید روحیں مشترکہ فکر و عمل کی بناء ڈالیں، آخری وحی کے حاملین کی ذمہ داری پہلے سے کہیں دوچند ہوگئی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وحی کی جگہ گاتی روشنی سے دنیا کو روشناس کون کرائے؟ آخر کون ہے جو قرآن مجید کو انسانی افکار و التباسات کی دھند سے بے نقاب کر سکے؟ گویا فی زمانہ کار نبوت کا فریضہ انجام دے تو کون؟

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ طبقہ علماء کو صورت حال کی سنگینی کا یا تو اندازہ نہیں یا پھر وہ صدیوں سے حساس اجتماعی امور پر خاموشی اختیار کئے رکھنے کو ہی اپنا وطیرہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ قدیم فقہی دائرہ فکر کے اسیر ہونے کی وجہ سے بھی ان سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اولاً وحی کو راست غور و فکر کا محور بنانے کی دعوت دے سکیں گے اور یہ کہ ان کی یہ دعوت دوسرے فقہی خیموں سے وابستہ علماء کے لئے قابل قبول بھی ہوگی یا نہیں۔ پھر یہ کہ تاریخ کے موجودہ انحراف کی درستی کے لئے طبقہ علماء پر مکمل انحصار گویا قرآن مجید کی اس صدائے انقلاب کی نفی ہوگی جس میں اس نے احبار و رہبان کے کسی طبقہ کی سخت مخالفت کی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فریضہ بتایا ہے کہ وہ ﴿يُضِعُّ عَنْهُمْ اَصْرَهُمَ وَالْاِغْلَالَ النَّيِّ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الأعراف: ۱۵۷)۔ تشریح و تعبیر کا حق جب کسی مخصوص طبقہ کا اجارہ نہیں تو پھر صرف کسی ایسے طبقہ کو کار نبوت کا سزاوار سمجھنا بھی مزید خوش گمانیوں کو جنم دے گا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آج طبقہ علماء کے مقابلے میں عام سلیم الطبع انسان قرآن سے راست اکتساب کے لئے کہیں زیادہ موزوں ہے کہ اس کا ذہن قدامت کی تفسیر و تعبیر کے تحفظات سے یکسر آزاد ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ ہے جس سے ہر خاص و عام اکتساب فیض کر سکتا ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی مذہبی کتاب نہیں بلکہ عالم انسانیت کا اجتماعی سرمایہ ہے۔ کسی ایسی کتاب ہدایت کو کسی طبقہ مخصوص کی تشریح و تعبیر کا مرہون منت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آخری وحی کے حاملین ہر قسم کے ذہنی تحفظ سے اوپر اٹھ کر اس کتاب ہدایت کو اقوامِ عالم کے لئے غور و فکر کا مشترکہ ایجنڈا بنائیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس کتاب سے پوری

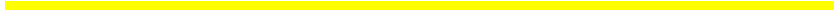
انسانی تاریخ کا مستقبل وابستہ ہو اس کی حتمی تشریح و تعبیر کا حق انسانوں کے ہی ایک طبقہ کو سونپ دیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن پر قاضی بننے یا خود کو religious authority سمجھنے کے بجائے قرآن کو بلا کسی پس و پیش قاضی برحق کی حیثیت سے قبول کر لیں۔ گویا قرآن مجید ہماری رہنمائی میں نہ چلے بلکہ ہم اس کی رہنمائی کے آگے پوری طرح سر جھکا دیں۔

مسلمانوں پر ہی کیا موقوف وہ تمام لوگ جو خود کو الہ واحد کا پرستار سمجھتے ہیں، ان کا تعلق خواہ کسی قوم یا تہذیب سے ہو، وہ بھی اگر کسی تعصب کے زیر اثر قرآن مجید کو مسلمانوں کی کتاب سمجھ کر اس سے بے نیازی برتتے ہیں تو ایسا سمجھنا انسانیت کے ایک عظیم ورثے کی نفی ہوگی اور خود ان مذاہب کی بنیادی روح کی بھی جس کے وہ خود کو امین سمجھتے ہیں۔ ہم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام تمام انبیاء کا دین ہے۔ ابراہیمؑ و اسمعیلؑ، اسحاقؑ و یعقوبؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دیگر انبیائے کرام کے تمام سلسلے اسی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دیتے رہے ہیں جس کی بنیاد پر آج بھی وحدت آدمیت کی تشکیل کا خواب ممکن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو مسلمانوں کی قومی شناخت کے بجائے عبودیت کے رویے کے طور پر دیکھا جائے۔ اللہ کو یہ ہرگز مطلوب نہیں کہ اس کے بندے خود اس کے دین کی بنیاد پر باہم منتشر اور متحارب ہو جائیں بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ توحید کی قوت پوری انسانیت کو ایک ایسی نظریاتی وحدت میں پرو دے جہاں تمام جھوٹی شناختیں اپنا اعتبار کھودیں۔ موجودہ دنیا میں اسلام کی واپسی کسی مخصوص قوم کے غلبہ پر ہرگز متبج نہ ہوگی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حق و باطل کے معرکے میں دنیا کے تمام سپرد کردہ نفوس، خواہ وہ کسی بھی تہذیب میں پائے جاتے ہوں، اپنے اندرون میں فتح و کامرانی کی یکساں طمانیت محسوس کریں۔ اسلام کے اس آفاقی پیغام کو بروئے کار لائے بغیر دنیا کی بے سمتی کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ وحی سے بے نیاز ہو کر الہ واحد کے سچے پرستار طمانیت سے سرشار ہو سکیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تمام ہی انبیائے کرام پر بھیجی گئی وحی انسانیت کا اجتماعی سرمایہ ہے۔ ہم جو خدائے واحد کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، کسی بھی آسمانی کتاب یا کسی بھی نبی کی تکذیب کی جرأت نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ خدا کے اس آخری آفاقی پیغام کو ازسرنو عام کرنے میں دیگر تہذیب کے نفوس کو اس میں شرکت سے روکے رکھیں۔

’انٹرنیشنل کاؤنسل آن اسلام‘ مسلمانوں کے علاوہ دیگر انبیاء کے متبعین کو بھی ﴿کَلِمَةُ سَوَاءٍ﴾ کی بنیاد پر فکر و عمل کے لئے میدان فراہم کرے گا۔ امید ہے آپ ہر طرح کے ذہنی تحفظ سے بالاتر ہو کر

انسانیت کی عمومی فلاح کی خاطر، دنیا کو موجودہ بے سمتی سے نجات دلانے کے لئے، ہماری اس دعوت کو قبول فرمائیں گے۔ دنیا بھر سے چوٹی کے علماء و مفکرین اور مختلف میدانوں کے رہنماؤں کو اس فورم میں شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے تاکہ عالمی بحران کے ازالے کے لئے کسی واقعی منصوبہ بند عالمی سطح کی کوشش کا مخلصانہ آغاز ہو سکے۔ کاؤنسل گا ہے بہ گا ہے اپنے اجلاس منعقد کرے گی جس کا مقصد ﴿فاستبقوا الخیرات﴾ کی فضا کو عام کرنا ہوگا۔

دعا ہے انسانی تاریخ کے بحران کو درست کرنے میں اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔



This document was created with Win2PDF available at <http://www.win2pdf.com>.
The unregistered version of Win2PDF is for evaluation or non-commercial use only.
This page will not be added after purchasing Win2PDF.